ذکرِ اردو

اردو کانفرس

۱۹۶۴ء

ذکر آردو

حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد
مرزا ناصر احمد
وزیر آغا
سہیل بخاری
وحید قریشی
سجاد باقر رضوی
ممتاز حسین
نسیم سیفی
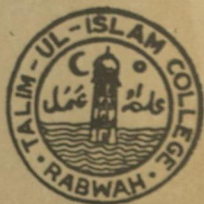
اردو کانفرنس
۱۹۶۴ء

انتساب

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کے نام

ع شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

حرف آغاز

سرمۂ مفت نظر ہوں میری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

۱۸ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو تعلیم الاسلام کالج ربوہ کی پہلی کل پاکستان اردو کانفرنس انعقاد پذیر ہوئی - اس کانفرنس میں ملک کے بعض نامور ادبأ اور شعراء نے شرکت فرمائی - جو مقالے اس کانفرنس میں پڑھے گئے ان کی افادیت کے پیش نظر انہیں یکجا کر کے شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں -

اردو کانفرنس کے انعقاد کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی قومی زبان کی ترویج و ترقی کے مسائل پر تعمیری نقطۂ نظر سے سوچ بچار کر سکیں - مجھے مسرت ہے کہ محض اللہ تعالی کے فضل و کرم سے ہماری یہ کانفرنس انتہائی کامیاب رہی - ہم نے یک گونہ احساس خلوص کے ساتھ ٹھنڈے دل سے

اہم مسائل پر خالصۃ علمی نقطہ نظر سے بحث کر کے اہل فکر کے لئے نئی راہیں متعین کی ہیں - امید ہے کہ علمی حلقوں میں ہماری یہ کوشش سعیٔ مشکور کا مرتبہ حاصل کرے گی اور ارباب نظر کو نئے انداز نظر سے اردو کے مسائل پر غور کرنیکی طرف متوجہ کر سکیگی - و ما توفیقنا الا باللہ العلی العظیم -

میں صمیم قلب سے ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو اس کانفرنس میں حاضرانہ یا غائبانہ شریک ہوئے اور اسے کامیاب بنایا -

فجزاھم اللہ احسن الجزاء

ناصر احمد پروازی
معتمد مجلس استقبالیہ
اردو کانفرنس

تعلیم الاسلام کالج ربوہ
بکم نومبر ۱۹۶۴ء

خطبهٔ استقبالیہ

حضرات!

السلام علیکم ورحمة اللہ و برکاتہ

تعلیم الاسلام کالج کی پہلی اردو کانفرنس کی تقریب پر میں تعلیم الاسلام کالج اور اپنی طرف سے جملہ مہمان حضرات کا اس تکلیف فرمائی پر تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے خوش آمدید کا ھدیہ پیش کرتا ھوں۔

نیز حرف آغاز کے طور پر یہ وضاحت ضروری خیال کرتا ھوں۔ کہ اس کانفرنس کے مقاصد خالصتاً تعمیری اور مثبت ھیں۔ ھم اردو کا مینار تخریب کی منفی اقدار پر استوار نہیں کرنا چاھتے۔ ھمارے نزدیک سلبی انداز فکر ذھنی افلاس کی علامت ھے۔ زندہ قوموں کی ھزار پہلو ضروریات اپنے اپنے مقام اور محل پر سب کی سب اھم اور ناقابل تردید حیثیت کی حامل ھوا کرتی ھیں۔ لیکن ھمارا موقف یہ ھے۔ کہ ان جملہ قومی تقاضوں کو ضروری خیال کرتے ھوئے بھی میزان عدل کا توازن برقرار رکھا جاسکتا ھے۔ اور اردو کو وہ ارفع مقام دیا جاسکتا ھے جو اسکا واجبی حق ھے۔

یہ ایک عظیم قومی حادثہ ہے۔ کہ زبان کا مسئلہ جو خالصۃ قومی اور علمی سطح پر حل کیا جانا چاہئے تھا ۔ سیاسی نعرہ بازی اور مہمل جذبات کا شکار ہو کر رہ گیا ۔ اور سترہ سال کا طویل عرصہ بےکار مباحث اور مجرمانہ غفلت کے ہاتھوں ضائع ہوگیا ۔ ہم تو سنتے آئے تھے ۔ کہ ہمارے معروف ''ساغر،، کا ایک دور ''صد سالہ دور چرخ،، کے ہم پلہ ہوا کرتا ہے ۔ اور رند جب میکدہ سے نکلتے ہیں تو دنیا بدلی ہوئی پاتے ہیں ۔ لیکن یہاں سترہ سال کے بعد بھی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اسلئے ضرورت اس امر کی ہے ۔ کہ سہل انگاری اور خوش فہمی کے گنبد سے نکل کر ہم حقائق کی دنیا میں قدم رکھیں ۔ ٹھنڈے دل سے اپنی مشکلات کا جائزہ لیں ۔ اور سنجیدگی سے اپنے تعلیمی ۔ تدریسی ۔ علمی ۔ ادبی ۔ لسانی اور طباعتی مسائل کا حل تلاش کریں ۔ زبان و بیان تلخیص و ترجمہ ۔ رسم الخط ۔ اور اسی قسم کے دیگر عقدوں کی گرہ کشائی کی کوشش کریں ۔ ایسا لائحۂ عمل بنائیں اور اسکی تشکیل ایسے خطوط پر کریں ۔ جس سے

یہ گومگو کی کیفیت ختم ہو اور اس ذہنی دھند سے نجات ملے - جو قومی افق پر عرصہ سے چھائی ہوئی ہے -

اس جگہ اس امر کا اظہار بھی غیر مناسب نہ ہوگا کہ اردو کے ساتھ جماعت احمدیہ کا ایک پائدار اور روحانی رشتہ بھی ہے - حضرت بانی سلسہ عالیہ احمدیہ علیہ السلام کی اکثر تصنیفات اردو ہی میں ہیں - اس لئے اردو زبان عربی کے بعد ہماری محبوب ترین زبان ہے - اسی لئے ساری دنیا میں جہاں احمدیہ مشن یا احمدی مسلمان موجود ہیں - وہاں اردو سیکھی اور سکھلائی جارہی ہے - زبان اردو کی یہ وہ ٹھوس اور خاموش خدمت ہے - جو جماعت احمدیہ دنیا کے گوشے گوشے میں کررہی ہے- اردو ہماری مذہبی زبان ہے-یہ ہماری قومی زبان ہے یہ ہماری آئندہ نسلوں کی زبان ہے- یہ وہ قیمتی متاع ہے جو ہمیں ہمارے اسلاف سے ورثے میں ملی ہے - اسے اس قابل بنائیے کہ ہماری آئندہ نسلیں اس ورثہ کو سرمایۂ افتخار تصور کریں اور اس پر بجا طور پر ناز کرسکیں - اور ہماری طرح گونگی اور 'بے زبان' ہو کر نہ رہ جائیں -

اردو ایک زندہ قوم کی زندہ زبان ہے - ادبیات کی

اھمیت مسلم - لیکن یہ نہ بھولئے کہ اردو زبان کا یہ بھی حق ہے کہ شعر و ادب کے روایتی اور محدود دائرے سے باھر نکلے اور زندگی کے ھر شعبے پر حاوی ھوجائے - ساری دنیا کے دلوں پر اس کی حکومت ھو - قومیں اسے لکھیں ، بولیں اور اس پر فخر کریں اور بین الاقوامی زبانوں کی محفل میں اردو بھی عزت کے بلند مقام پر سرفراز ھو -

ان دعائیہ الفاظ کے ساتھ میں ایک بار پھر اپنے دوستوں اور بزرگوں کو اھلاً وسھلاً ومرحبا کھتا ھوں - اور اللہ تعالی کے حضور دست بدعا ھوں کہ وہ ھم سب کو ایسا انداز فکر عطا فرمائے اور اس نہج پر کام کرنے کی توفیق دے جو نہ صرف زبان اردو کے لئے بلکہ ھمارے لئے اور ھماری آنیوالی نسلوں کے لئے خیروبرکت کا باعث ھو - اللھم آمین

مرزا ناصر احمد
ایم-اے (آکسن)
پرنسپل تعلیم الاسلام کالج ربوہ

خطبۂ افتتاح

اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے یوں تو بہت سے اقدامات ضروری ھیں لیکن اس سلسلے میں اردو کانفرنسوں کا انعقاد ایک خاص اھمیت رکھتا ھے۔ ھمارے ملک میں بالعموم ھر تحریک نہ صرف بعض بڑے ثقافتی مراکز سے جنم لیتی ھے بلکہ پروان چڑھنے کے بعد وھیں کی ھو کر بھی رہ جاتی ھے۔ اس سے تحریک میں وہ کشادگی اور وسعت پیدا نہیں ھوتی جو اس کی پوری کامیابی کے لئے نہایت ضروری ھے۔ اردو زبان کی ترویج کے سلسلے میں جو تحریکات وجود میں آئیں وہ عام طور سے لاھور اور کراچی ایسے مراکز ھی سے وابستہ رھیں۔ تعلیم الاسلام کالج ربوہ نے اس انجماد کو توڑا ھے اور اردو کانفرنس کے انعقاد سے اس بات کو ثابت کیا ھے کہ اب اردو کے لئے محبت اور اردو کو قومی زبان کا درجہ دینے کی آرزو بڑے بڑے مراکز تک ھی محدود نہیں رھی۔ گویا اس خوشبو کی طرح جو دیوار چمن کو پار کر جاتی ھے اردو زبان کی ترویج و اشاعت کی تحریک بھی اونچی دیواروں کو

پار کر کے افق کے پہاڑوں سے آ ٹکرائی ہے - مجھے یقین ہے کہ آپ نے جو مبارک قدم اٹھایا ہے اس کی ملک کے طول و عرض میں عام طور سے تقلید ہوگی اور ہم اردو زبان کو ملک کے دور دراز گوشوں تک پہنچا سکیں گے آپ کی یہ اردو کانفرنس اس لئے بھی اہم ہے کہ اس کے پس پشت اردو زبان کے لئے بے پناہ محبت کے سوا کوئی اور جذبہ موجزن نہیں - اور آپ نے اسے پنجاب کے دیہاتی علاقہ میں منعقد کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو زبان پنجاب کے دور دراز گوشوں میں بھی ویسی ہی مقبول ہے جیسی کہ اردو کے بڑے بڑے مراکز میں - مجھے یقین ہے کہ آپ نے اردو کانفرنس کے منعقد کرنے کی جو روایت قائم کی ہے اسے ہمیشہ جاری رکھیں گے اور مجھے امید ہے کہ ہمارے ملک کے دوسرے ادارے اس سلسلے میں آپ کے نقش قدم پر چلنے کی پوری کوشش کریں گے -

وزیر آغا

ایم اے، پی ایچ - ڈی،

پیغامات

اختر حسین

صدر انجمن ترقی اردو
پاکستان - کراچی

مجھے یہ جان کر بے انتہا مسرت ہوئی ہے کہ آپ ربوہ میں کل پاکستان اردو کانفرنس منعقد کر رہے ہیں - اس قسم کے اجتماعات زبان و ادب کے حق میں بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں - یہاں اہل فکر و نظر کو یکجا ہو کر اہم مسائل پر غور و فکر کرنے کا موقع ملتا ہے اور زبان و ادب کی ترویج کے نئے نئے راستے سامنے آتے ہیں -

اردو کو اس وقت جو مسائل درپیش ہیں وہ گوناں گوں نوعیت کے ہیں - ہماری ایک قدیم کمزوری یہ ہے کہ ہم ہر معاملے کا جو حل بھی تلاش کرتے ہیں اس میں حکومت سے چند مطالبات ضرور شامل کئے جاتے ہیں اور گاہے گاہے انہیں دھرایا جاتا ہے لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اس سلسلے میں کچھ ہمارے بھی فرائض ہیں جن پر ہمیں عمل کرنا چاہیئے۔ مثلاً ہم یہ تو کہہ دیتے ہیں کہ حکومت کی فلاں

کارروائی اردو میں نہیں ہوئی ، لیکن یہ کبھی نہیں سوچتے کہ خود ہم نے اردو کو کس حد تک اپنایا ہے ، اور اسے کس انداز سے اپنی ذات کا ایک جزو بنایا ہے ، اردو کے سلسلے میں ہم دوسروں کا محاسبہ تو کر کر لیتے ہیں لیکن کبھی کبھی اپنا محاسبہ بھی کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ۔ اس طرح حقوق و فرائض کے معاملے میں ایک خوشگوار توازن پیدا ہوجائیگا ۔

آج ہمارا ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ اردو کو پاکستان کی دوسری علاقائی زبانوں سے زیادہ سے زیادہ قریب کس طرح لایا جائے ۔ میری خواہش ہے کہ اس کانفرنس میں جو اہل علم شریک ہو رہے ہیں وہ اس مسئلے پر پوری طرح سوچ بچار کریں ، کیوں کہ ہماری قومی ترقی کے لئے اردو اور علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا بہت ضروری ہے ، جو لوگ اردو اور علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے کا حریف سمجھتے ہیں ، وہ نہ اردو کے خیرخواہ ہیں نہ علاقائی زبانوں کے ۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اردو اپنے مزاج و منہاج اور رسم الخط کے اعتبار سے مغربی پاکستان کی تمام علاقائی زبانوں سے مکمل مماثلت رکھتی ہے ۔ اب ضرورت

اس بات کی ہے کہ اس مماثلت کو مزید بڑھایا جائے
مجھے توقع ہے کہ آپ اس سلسلے میں ضرور کوئی
عملی اقدام کریں گے۔

میں آپ کی کانفرنس کی کامیابی کے لئے دست
بدعا ہوں۔

اختر حسین
(صدر)

اشتیاق حسین قریشی
وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی کراچی

مکرمی ، زاد عنایتکم

اردو کانفرنس میں شرکت کی دعوت کا شکریہ ،
میں مشاغل کی کثرت کے باعث شرکت سے معذور ہوں
امید ہے کہ آپ معاف فرمائیں گے ۔

میرے لئے یہ امر باعث طمانیت ہے کہ مغربی
پاکستان میں اپنی قومی زبان کی طرف سے بیداری بڑھتی
جاتی ہے آپ کی کانفرنس بھی اسی بیداری کی ایک علامت
ہے یہ ظاہر ہے کہ اگر ہم نے جلد از جلد اپنی زبان
کو اولیت نہ دی اور اسے تعلیم ، تحریر اور تقریر کا
ذریعہ نہ بنایا تو نہ ہم کسی قسم کی علمی یا ثقافتی
ترقی کر سکتے ہیں اور نہ دنیا کی سرفراز اقوام میں
شمار ہو سکتے ہیں ۔ ترقی تو درکنار ہمارا احساس

کمتری اور گہرا ہوتا جائے گا اور ہم نہ اپنی ثقافت کو
بچا سکیں گے نہ اپنی دینی روایات کو برقرار رکھ سکینگے۔

میری دلی تمنا ہے کہ آپ کی کانفرنس کامیاب ہو
اور اردو کی مشعل کو کسی قدر اور بلند کر سکے۔

مخلص

اشتیاق حسین قریشی

اردو رسائل زبان کی کس طرح خدمت کر سکتی ہیں

حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب
امام جماعت احمدیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اے کہ ہے نغمہ زن و زمزمہ خوان اردو
اے کہ ہے صبح و مسا محو بیان اردو
اس کی پہلے سے ترقی تو مسلم لیکن
بات جب ہے کہ بڑھے اور بھی شان اردو

آج سے تینتیس برس پہلے حضرت امام جماعت احمدیہ ایدہ اللہ تعالی نے

''اردو رسائل زبان کی کس طرح خدمت کر سکتے ہیں''

کے اہم موضوع پر ایک قیمتی مضمون سپرد قلم فرمایا تھا۔ جسے بر صغیر پاک و ھند کے نامور ادیب مولانا احسان اللہ خان تاجور نجیب آبادی نے اپنے رسالہ ''ادبی دنیا'' (مارچ ۱۹۳۱ء) میں آپ کا فوٹو دے کر شائع کیا اس زمانہ میں رسالہ ''ادبی دنیا'' کے نگران

اعلی سر عبدالقادر مرحوم تھے اور مدیر مولانا تاجور نجیب آبادی!

علامہ تاجور نے حضور کے مضمون کے ساتھ درج ذیل ادارتی نوٹ تحریر فرمایا اور حضرت امام جماعت احمدیہ کی اردو نوازی اور ادبی خدمات کو شاندار خراج تحسین ادا کیا:

''حضرت مرزا بشیرالدین محمود احمد صاحب امام جماعت احمدیہ کی توجہات بیکراں کا میں سپاس گزار ہوں کہ وہ ادبی دنیا کی مشکلات میں ھماری عملی امداد فرماتے ھیں۔

میں نے ان کی جناب میں امداد کی نہ کوئی درخواست کی تھی نہ مجھے احمدی ہونے کا شرف حاصل ہے اور نہ ''ادبی دنیا،، کوئی مذھبی پرچہ ہے مگر حضرت مرزا صاحب اپنی عزیز مصروفیتوں میں سے علم و ادب اور علم و ادب کے خدمت گزاروں پر توجہ فرمائی کے لئے بھی وقت نکال لیتے ھیں ملکی زبان و ادب سے جناب موصوف کا یہ اعتنا ان علماء کے لئے قابل توجہ ہے جو اردو ادب کی خدمت کو تضیع اوقات سمجھتے ھیں،،

(ادبی دنیا مارچ ۱۹۳۱ء)

پھر لکھا :

"امام جماعت احمدیہ مرزا غلام احمد صاحب کے خلف الرشید اور ان کے خلیفہ ھیں مرزا صاحب مرحوم کی تصانیف اردو ادب کا ایک ذخیرہ بیکراں ھیں الولد سرلابیہ کے مطابق ان کے نامور فرزند کے دل میں اردو زبان کے لئے ایک لگن اور اردو کے خدمت گزاروں سے ایک لگاؤ موجود ہے"

(ادبی دنیا اپریل ۱۹۳۱ء)

(مرتبہ مولینا دوست محمد صاحب شاھد)

اردو رسائل زبان کی کس طرح خدمت کرسکتے ہیں

اردو زبان کی بڑی دقتوں میں سے ایک دقت یہ ہے کہ اس کی لغت کتابی صورت میں پوری طرح مدون نہیں ہے اور نہ اس کے قواعد پورے طور پر محصور ہیں اور نہ مختلف علمی مضامین کے ادا کرنے کے لئے اصطلاحیں مقرر ہیں ۔ مولوی فتح محمد صاحب جالندھری نے قواعد کے بارے میں اچھی خدمت کی ہے اور مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق صاحب نے ان کے کام کو جلا دینے میں حصہ لیا ہے ۔ لغت کا کام مولوی نذیر احمد دھلوی نے کیا ہے ۔ اور اصطلاحات کے لئے ہم عثمانیہ یونیورسٹی کے ممنون ہیں ۔ انجمن ترقی اردو انہی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے بہت کچھ کر رہی ہے ۔ لیکن کام اس قدر ہے کہ کسی ایک شخص یا ایک انجمن یا ایک ادارہ سے یہ ہونا ناممکن ہے ۔

اردو کے بہی خواہوں نے میرے نزدیک بعض مشکلات کو جو اردو زبان سے مخصوص ہیں نظرانداز کر دیا ہے ۔ مثلاً

(۱) وہ سب زبانوں میں عمر میں چھوٹی ہے ۔

(۲) حقیقی شاہی گود میں پلنے کا اسے کبھی موقعہ نہیں ملا - جو زبان کی ترقی کے لئے ضروری ہے -

(۳) اصل میں تو تین لیکن کم سے کم دو مائیں اس کی ضرور ہیں اور مصیبت یہ ہے کہ دونوں سگی ہیں - ہر ایک اپنی تربیت کا رنگ اس پر چڑھانا چاہتی ہے - اور جب ان کا آپس میں اتحاد نہیں ہو سکا تو دونوں اپنا غصہ اس معصوم پر نکالتی ہین - میں نے تو جہاں تک غور کیا ہے اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس وقت جھگڑا یہ نہیں کہ اہل سنسکرت اردو کو اپنا بنانے کو تیار نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ اسے صرف اپنا ہی بنائے رکھنے پر مصر ہیں اور عربی فارسی والوں کے سایہ سے اس نونہال کو دور رکھنا چاہتے ہیں - اور یہی حال ان کا بھی ہے -

(۴) ہمارا علمی طبقہ غیر زبانوں میں سوچنے کا عادی ہو گیا ہے - اور اس وجہ سے اس کی تحقیق و تفتیش سے اردو نفع نہیں اٹھا سکتی

(۵) ٹائپ نہ ہونے کے سبب آنکھوں کو اس کے حروف سے وہ موانست نہیں پیدا ہوتی جو ٹائپ پر چھپنے والی زبانوں کے حروف سے ہو جاتی ہے اور اس وجہ سے لوگوں میں شوق تعلیم سرعت سے ترقی نہیں کر سکا اور کتابوں کی اشاعت وسیع پیمانے پر نہیں ہو سکی ۔ انسان بارہ تیرہ قسم کے ٹائپوں کا عادی تو ہو سکتا ہے لیکن ہزاروں قسم کا نہیں اور اردو زبان کے جتنے کاتب ہیں گویا اتنے ہی ٹائپ ہیں جس کی وجہ سے طبیعتوں پر ایک غیر محسوس بوجھ پڑتا ہے اور تعلیم کا ذوق کم ہو جاتا ہے ۔

ان مشکلات کی وجہ سے اُردو کی ترقی کے رستے میں دوسری زبانوں کی نسبت زیادہ مشکلات حائل ہیں مگر میرے نزدیک وہ ایسی نہیں کہ دور نہ کی جا سکیں ۔ اب تک نقص یہی رہا ہے کہ مرض کی تشخیص نہیں کی گئی اور اس کی وجہ سے لازماً علاج بھی صحیح نہیں ہوا اگر اردو عمر میں اپنی بہنوں سے چھوٹی تھی تو اس کے لئے اس قسم کی غذا کا بھی انتظام ہونا چاہیے تھا ۔ اور

اگر وہ شاہی گود سے محروم تھی تو کیوں نہ اسے جمہوریت کی گود میں ڈال دیا گیا جس کی حفاظت شاہی حفاظت سے کسی صورت میں کم نہیں ۔ بلکہ اصل بادشاہت تو اس کی ہے ۔ اگر اس کی تربیت کے متعلق اختلاف تھا تو یہ صورت حالات پیدا کرنے کی بجائے کہ جس کا بس چلا وہ اسے اپنے گھر لے گیا وہی کیوں نہ کیا گیا جو حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس وقت کیا تھا جب خانہ کعبہ کی تعمیر جدید کے موقعہ پر حجر اسود کو اٹھا کر اس کی جگہ پر رکھنے کے سوال پر مختلف قریش خاندانوں میں جھگڑا پیدا ہو گیا تھا ۔ اور انہوں نے ایک چادر بچھا دی اور اس پر حجراسود اپنے ہاتھ سے رکھ کر سب قوموں کے سرداروں سے کہا کہ وہ اس چادر کے کونے پکڑ لیں ۔ اور اس طرح سب کے سب اس کے اٹھانے میں برابر کے شریک ہو جائیں ۔ اسی طرح اگر اردو ، سنسکرت اور عربی کی مشترک تربیت میں دے دی جاتی تو یہ جگڑا ختم ہو سکتا تھا ۔

ٹائپ کا سوال مختلف قسم کا سوال ہے لیکن اگر مذکورہ بالا باتوں کی طرف توجہ ہوتی تو بہت سے لوگ اسے حل کرنے کی طرف بھی مائل ہو جاتے ۔ اور

الحمدللہ کہ اس وقت حیدرآباد میں بہت سے ارباب بصیرت اس کے لئے کوشش کر رہے ہیں ۔

میری ان معروضات کا مطلب یہ ہے کہ اردو کی ترقی کے لئے ایسے ذرائع اختیار کرنے چاہئیں کہ ایک محدود جماعت کی دلچسپی کا مرکز بننے کی بجائے جمہور کو اس سے دلچسپی پیدا ہو ۔ خالص علمی رسائل صرف منتخب اشخاص کی توجہ منعطف کرا سکتے ہیں ۔ اور زبانیں چند آدمیوں سے نہیں بنتیں خواہ وہ بہت اونچے پایہ کے کیوں نہ ہوں ۔ قاعدہ یہ ہے کہ زبان عوام الناس بناتے ہیں اور اصطلاحیں علماء ۔ اروو بھی اس قاعدہ سے مستثنی نہیں ہو سکتی ۔

پس اگر ہم اردو کی ترقی کے مقصد میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو اس کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ ہمارے ادبی رسالوں میں اس کے علمی پہلوؤں پر بحثیں ہوں تاکہ صرف پیش آنے والی مشکلات کے علاج کا ہی سامان نہ ہو بلکہ عوام الناس بھی ان تحقیقات سے واقف ہوتے جائیں ۔ اس وقت خداتعالی کے فضل سے کئی اردو رسائل کامیابی سے چل رہے ہیں ۔ اگر ان رسائل میں چند صفحات مستقل طور پر اس بات کے لئے وقف ہو جائیں

که ان میں اردو زبان کی لغت یا قواعد یا اصطلاحوں
وغیرہ پر بحثیں ہوا کرینگی تو یقیناً تھوڑے عرصہ میں
وہ کام ہو سکتا ہے جو بڑی بڑی انجمنین نہیں کرسکتیں۔
اور بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جو نئی نئی اختراعیں ہوں گی یا
الفاظ کے استعمال یا قواعد زبان کے متعلق جو پہلو زیادہ
وزنی معلوم ہوگا عام لوگ بھی اس کو قبول کرلینگے۔
کیونکہ دلچسپ اردو رسائل میں چھپنے کی وجہ سے وہ
سب مضامین ان کی نظروں سے بھی گذرتے رہیں گے۔ ہاں
یہ مدنظر رہے کہ مضمون ایسے رنگ میں ہو کہ سب
لوگ اسے سمجھ سکیں۔ اس قسم کے مضامین کی اشاعت کا
فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ہمارے ہندو بھائی بھی ان بحثوں
میں حصہ لے سکیں گے اور اس میں کیا شک ہے کہ
بغیر ان کی مدد کے ہم یہ کام نہیں کر سکتے۔ کیونکہ
اردو میں بہت سے لفظ سنسکرت اور ہندی بھاشا کے ہیں
اور ان کی اصلاح یا ان میں ترقی بغیر ہندوؤں کی مدد کے
نہیں ہو سکتی۔ ان کی شمولیت کے بغیر یا تو وہ حصہ
زبان کا نامکمل رہ جائیگا۔ یا اسے بالکل ترک کر کے اس
کی جگہ عربی الفاظ اور اصطلاحیں داخل کرنی پڑینگی اور
یہ دونوں باتیں سخت مضر اور اردو کی ترقی کے راستہ

میں روک پیدا کرنے والی ہونگی -

اس تمہید کے بعد میں ایڈیٹر صاحب ادبی دنیا اور دوسرے ادبی رسائل سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ ان باتوں میں مجھ سے متفق ہوں تو اپنے رسائل میں ایک مستقل باب اس غرض کے لئے کھول دیں لیکن انہیں ان مشکلات کا بھی اندازہ کر لینا چاہیے جو اس کام میں پیش آئینگی - مثلاً - یہ کہ جو سوالات اٹھائے جائینگے انہیں حل کون کرے گا ؟ بالکل ممکن ہے - کہ جواب دینے والے ایسے لوگ ہوں جن کا کلام سند نہ ہو یا جن کے جواب تسلی بخش نہ ہوں - یا کوئی شخص جواب کی طرف توجہ ہی نہ کرے - اگر صرف رسالہ کے ادارہ نے جواب دیئے تو پھر اول تو اصل مطلب فوت ہو جائیگا - دوم ممکن ہے کہ اس سے وہ اثر پیدا نہ ہو سکے - جو اصل مقصود ہے لہذا اس مشکل اور اس قسم کی دوسری مشکلات کے حل کے لئے میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ جو رسالہ اس تحریک پر عمل کرنا چاہے اس میں ایک ادبی کلب قائم کر دی جائے - ادارہ کی طرف سے متعدد بار تحریک کر کے رسالہ کے خریداروں کے نام ظاہر کریں جو خریدار

مستند ادیب ہیں ان سے اصرار کر کے اپنا نام پیش کرنے کے لئے کہا جائے ۔ ایسے تمام خریداروں کے نام ایک رجسٹر میں جمع کر لئے جائیں ۔ اور انہیں ادبی کلب کا ممبر سمجھا جائے چونکہ بالکل ممکن ہے کہ بہت سے ادیب اور علماء جن کی امداد کی ضرورت سمجھی جائے رسالہ کے خریدار نہ ہوں ۔ اس لئے ایسے لوگوں کی ایک فہرست تیار کی جائے ۔ اور رسالہ کے مستطیع خریداروں کی امداد سے ان کے نام رسالہ مفت ارسال کیا جائے ۔ اور ان کا نام اعزازی ممبر کے طور پر کلب کے رجسٹر میں درج کر لیا جائے ۔

تمام ممبروں سے امید کی جائے کہ جب کبھی کوئی سوال (۱) اردو لغت کے متعلق ۔ (۲) نحوی قواعد کے متعلق (۳) بعض علمی خیالات کے ادا کرنے میں زبان کی دقتوں کے متعلق (۴) محاورات کے متعلق ۔ (۵) تذکیروتانیث اور جمع کے قواعد کے متعلق ۔ (۶) پرانی اصطلاحات کی تشریح یا نئی اصطلاحات کی ضرورت کے متعلق پیدا ہو تو بجائے خود حل کرکے خود ہی اس سے لطف حاصل کرنے کے وہ اس سوال کو رسالہ کے ادبی کلب کے حصہ میں شائع کرائیں ۔ خواہ اپنا حل بھی ساتھ

ہی لکھ دیں یا خالی سوال ہی لکھ دیں۔

ان سے یہ بھی امید کی جائے کہ جب کوئی ایسا سوال شائع ہو تو وہ اس کا جواب دینے کی کوشش کیا کریں۔

ملک اردو علم و ادب کے لحاظ سے چند حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ مثلاً (۱) دہلی اور اس کے مضافات (۲) لکھنؤ اور اس کے مضافات (۳) پنجاب (۴) رامپور اور اس کے مضافات (۵) بھوپال اور اس کے مضافات۔ (۶) آگرہ اور اس کے مضافات۔ (۷) اعظم گڑھ اور الہ آباد اور اس کے مضافات۔ (۸) بہار۔ (۹) حیدر آباد۔

اس طرح علمی لحاظ سے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے

(۱) اسلامی یعنی عربی اور فارسی اثر۔

(۲) ہندو یعنی سنسکرت اور ہندی بھاشا اثر۔

جب سوالات رسالہ کے دفتر میں آئیں تو ادارہ انہیں مختلف حصوں میں تقسیم کر دے مثلاً جو سوال کسی لفظ کے استعمال اس کی شکل۔ اس کی تذکیر و تانیث کے متعلق ہوں انہیں ایک جگہ جمع کر کے شائع کرے اور ان کے متعلق مذکورہ بالا حلقوں کے احباب سے درخواست

کرے کہ وہ نہ صرف اپنی علمی تحقیق بتائیں بلکہ یہ
بھی بتائیں کہ ان کے علاقہ میں وہ لفظ اردو میں استعمال
ہوتا ہے یا نہیں ۔ اگر ہوتا ہے تو کس شکل میں ۔
اور کن کن معنوں میں ؟ اس طرح دو فائدے حاصل
ہونگے ایک تو اس امر کا اندازہ ہو جائے گا کہ اس
خاص لفظ یا محاروہ کے متعلق اردو بولنے والوں کی
اکثریت کس طرف جا رہی ہے ۔ اور اس سے اردو کی
ترقی کی روکا اندازہ ہو سکے گا ۔ دوسرے علمی تحقیق
بھی ہو جائیگی اور پڑھنے والوں کی طبائع فیصلہ کر
سکیں گی کہ اس بارہ میں ارود کے حق میں کونسی بات
مفید ہے ۔ آیا تحقیق کی پیروی کرنی چائیے یا غلط العام
کی تصدیق کہ یہ دونوں باتیں اپنے اپنے موقع پر زبان
کی ترقی کے لئے ضروری ہوتی ہیں ۔ اسی طرح جس لفظ
کے متعلق بحث ہو اگر سنسکرت یا ھندی بھاشا اس کا
ماخذ ہو تو اس کے علماء کو اور عربی فارسی ماخذ ہو
تو اس کے علماء کو اس پر روشنی ڈالنے کی طرف توجہ
دلائی جائے ۔ اس طرح اور بہت سی تقسیمیں کی جا سکتی
ہیں جو اس کلب کو زیادہ دلچسپ بنانے کا باعث ہو
سکتی ہیں کلب کا کام فیصلہ کرنا نہ ہو بلکہ ہر پہلو

کو روشنی میں لانا ہو ۔

اسی طرح جدید اصطلاحات کی ضرورتوں کو کالب کے صفحات میں شائع کیا جائے اور بحث کی طرح اس طریق پر نہ ڈالی جائے کہ خالص عربی یا خالص سنسکرت اصطلاحات لے لی جائیں بلکہ تحریک یہ کی جائے ۔ کہ وہ خیال جس کے ادا کرنے کی ضرورت پیدا ہوئی ہے ۔ اس کے متعلق کالب کے ممبر پہلے یہ بحث کریں کہ اس خیال کا کس اردو لفظ سے تعلق ہے ۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ وہ لفظ کس زبان کا ہے اور آیا اس لفظ سے جدید اصطلاح کا بنانا آسان ہوگا ۔ اگر عام رائے اس کی تائید میں ہو تو پھر اس زبان کے ماہروں سے درخواست کی جائے کہ وہ اس کے متعلق اپنا خیال ظاہر کریں ۔ کیونکہ جس زبان کا لفظ ہو اس کے ماہر اس کے صحیح مشتقات پر روشنی ڈال سکتے ہیں ۔

ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ اردو رسائل کے ادارے تو پہلے ہی بوجھوں تلے دبے پڑے ہیں وہ اتنی پیچیدہ سکیم پر کس طرح عمل کر سکتے ہیں ۔ لیکن اول تو یہ سکیم عمل میں اسقدر پیچیدہ اور توجہ طلب نہ ہوگی جس قدر کاغذ پر نظر آتی ہے ۔

دوسرے اس قسم کے کلب جیسا کہ یورپ کا تجربہ ہے ہمیشہ رسائل و اخبارات کی دلچسپی اور اور خریداری بڑھانے کا موجب ہوتے ہیں اس لئے جو رسالہ اس کام کو شروع کرے گا وہ میرے نزدیک مالی پہلو سے فائدہ میں رہے گا۔ تیسرے یہ بھی ضروری نہیں کہ فوراً اس ساری سکیم پر عمل کیا جائے ہو سکتا ہے کہ کلب جاری کر کے صفحات مقرر کئے بغیر اور اس طرح مضامین تقسیم کئے بغیر جس طرح میں نے بیان کیا ہے کام شروع کر دیا جائے۔ پھر جوں جوں ادارہ اور کلب کے ممبروں کو مشق ہوتی جائے کام اصول کے ماتحت لایا جائے تھوڑی سی ہمت کی ضرورت ہے اور بس۔ ادبی دنیا کے لئے اور اگر کوئی اور رسالہ اس تحریک پر عمل کرنے کے لئے تیار ہو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ضرورت ہو تو میں اس بحث کو واضح کرنے کے لئے اور اس تحریک سے لوگوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے بشرط فرصت اور مضامین بھی لکھ سکتا ہوں ،،

(رسالہ ادبی دنیا مارچ ۱۹۳۱ء
صفحہ ۱۸۶ تا ۱۸۸)

ادب اور زندگی کا رشتہ

سجاد باقر رضوی

اگر کوئی سکہ کثرت استعمال سے اتنا گھس جائے کہ اس پر کوئی نشان باقی نہ رہے یا کوئی نوٹ پرانا ہو جائے اور پھٹ جائے تو ہم ایسے سکوں اور نوٹوں کو اول تو قبول نہیں کرتے اور اگر قبول کرتے ھیں تو بہ جبرواکراہ اور پھر انھیں جلد از جلد اپنی جیب سے نکال دینا چاھتے ھیں۔ کچھ اسی قسم کا رویہ موضوعات اور تصورات کے ساتھ بھی اختیار کیا جاتا ھے۔ ھم ایسے موضوعات کے بارے میں جو روزمرہ کے لین دین کی وجہ سے پرانے نوٹوں کی طرح میلے اور بدنما ھوجاتے ھیں یا تو سوچتے نہیں اور اگر مجبوراً سوچنا پڑے تو جلد ھی انھیں ذھن سے خارج کردیتے ھیں۔

"ادب برائے زندگی" اور "ادب برائے ادب" کے بارے میں اردو کا تنقیدی سرمایہ کسی حیثیت سے کم نہیں ھے۔ سچی بات یہ ھے کہ ان موضوعات پر اتنا زیادہ سوچا اور لکھا گیا ھے کہ اب ان میں اضافے کی کوشش کا مطلب بے جا تکرار ھوگا۔ مجھے اس بات کا احساس ھے کہ جن موضوعات کی ذیل میں میری ذھنی نشوونما ھوئی ھے ممکن ھے وھی موضوعات مجھ سے کم عمر طالب علموں اور دانشوروں کے لئے

نئے ہوں اور ایسے میں محض پچھلی باتوں کو دھرا دینا بھی کوئی عیب نہ ہوگا۔ مگر اب جبکہ اس احساس کے تحت میں چند باتیں کہنے کھڑا ہوا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے اردو کے سارے جانے پہچانے ادیب صف آرا ہوگئے ہیں جنھوں نے اس مسئلہ پر بلاواسطہ یا بالواسطہ کوئی نہ کوئی بات ضرور کہی ہے۔ اور جب میں ان سے آنکھیں چراتا ہوں تو اردو ادب کی دو بڑی تحریکیں سامنے ابھر آتی ہیں ——— "ترقی پسند تحریک" اور "ارباب ذوق" کی تحریک ——— یہ دونوں تحریکیں انھیں دو موضوعات کی بنیاد پر ایک مدت تک آپس میں دست و گریبان رہی ہیں۔

لیجئے ایک لمحہ کے لئے میں اپنی آنکھیں بند کرتا ہوں اور اندھیرے میں ایک خاص زاوئیے سے روشنی ڈالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس طرح اس بات کا امکان ہے کہ حقائق، جو ہر جانب بکھرے پڑے ہیں کسی خاص ترتیب سے میرے سامنے آ جائیں ——— آخر آپ اپنے سکوں اور نوٹوں کو بینک سے تبدیل بھی تو کر سکتے ہیں ——— پرانے موضوعات پر نئے زاویوں سے نگاہ ڈالنا ——— انھیں نئے سرے سے مرتب کرنا، ان کا

از سرنو تجزیہ کرنا ، اور اس طرح انھیں نئے مفاہیم سے روشناس کرنا بھی تو کسی قدر اور اھمیت کا کام ھے ؟ ۔ ذرا غور کیجئے تو پتہ چلے گا کہ زمانہٗ قدیم سے لیکر آج تک اکثر مسائل عہد بہ عہد اپنا سر اٹھاتے رھے ھیں ، عہد بہ عہد اکثر سوالات کی نوعیت ایک ھی رھی ھے البتہ ھر عہد میں مسائل کے حل اور سوالات کے جواب ، عہد کے تقاضوں کے مطابق مختلف ھوجاتے ھیں ۔ گویا سونا ھر عہد میں ایک ھی ھوتا ھے مگر ھر زمانہ اپنے اپنے فیشن اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق زیورات ڈھالتا ھے ۔ لیجئے ، میں بھی اس پرانے سوال کا ، کہ ادب اور زندگی کے درمیان کیا رشتہ ھے ، آج کے تقاضوں کے مطابق ، جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا ھوں ۔ تا ھم ، آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں ذرا اس سوال کو الٹ پلٹ کر دیکھ لوں ۔

اب آپ بھی میرے اس کام میں میرا ھاتھ بٹائیں اور اس سوال کو دو مختلف سمتوں سے دیکھیں (۱) زندگی کی طرف سے (۲) ادب کی طرف سے ۔ اس سوال کو زندگی کی طرف سے دیکھئے تو ضمنی سوالات یہ ھوں گے :-

(۱) ادب کی تخلیق میں زندگی کا کیا رول

ہوتا ہے ؟

(۲) زندگی کس طرح ادبی تخلیق کے لئے محرکات و موضوعات فراہم کرتی ہے ؟

(۳) معاشی ، معاشرتی ، اور سیاسی حالات ادب کی تخلیق پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں ؟

(۴) زندگی میں ادب کا کیا مقصد ہے اور اس کی افادیت کیا ہے ؟

آپ یہ بات نہ بھولئے کہ آپ زندگی کی طرف کھڑے ہیں اور جب زندگی کی طرف رہ کر آپ ان ضمنی سوالات کے جواب دیں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ادب کو بھی زندگی کے دوسرے عوامل کی طرح ایک عمل سمجھیں گے - لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ادب تجارت ، سیاست ، قانون اور انجینیرنگ کی طرح فعال عمل نہیں ہے اور جب آپ اس عمل کا مقابلہ دوسرے عوامل سے کریں گے تو پھر ادبی تخلیق کے عمل کو شک کی نظر سے دیکھیں گے - ادب سیاست اور معاشی سرگرمیوں کی طرح زندگی پر براہ راست اثر انداز نہیں ہوتا اور شاید اسی لئے آپ اس عمل کو دیگر

عوامل کی طرح سنجیدہ عمل نہیں سمجھیں گے ۔ آپ کے ذہن میں ایک موٹا سا ، سامنے کا سوال پیدا ہوگا کہ زندگی میں کونسا عمل بنیادی اہمیت کا حامل ہے ! ماچس بنانے کا عمل جس کی غیر موجودگی میں بے شمار گھروں میں آگ نہیں سلگے گی یا شعر کہنے کا عمل جس کا بظاہر زندگی پر کوئی اثر نہیں ہوتا یا کم‌ازکم اتنا فوری اور روشن اثر نہیں ہوتاجتنا کہ ماچس کی ایک تیلی کا ہوتا ہے ۔

اب آپ تھوڑی سی زحمت اٹھائیں اور دوسری طرف آکر اسی سوال کو ادب کی طرف سے پرکھیں ۔ دیکھا ، آپ نے رخ بدلا تو اب آپ کے ضمنی سوالات کی نوعیت بھی بدل گئی (کیا آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ دنیا کے متعلق بلکہ دنیا کی ہر چیز کے متعلق آپ کے تصورات کا تعین وہ سمتیں کرتی ہیں جنکے مطابق آپ ان چیزوں کو دیکھتے ہیں) لیجئے ، اب آپ کے ضمنی سوالات یہ ہو گئے :

(۱) ادب کا زندگی پر کیا اثر ہوتا ہے اور وہ زندگی پر کیسے اثرانداز ہوتا ہے ؟

(۲) معاشرے کے طرز احساس کی تربیت میں

ادب کا کیا حصہ ہے اور طرز احساس کی بدولت معاشرے کا فکری و شعوری نظام کس طرح متاثر ہوتا ہے ؟

(۳) معاشرے کے افراد کی جذباتی تنظیم اور تزکیہ نفس کے لئے ادب کیا کام سرانجام دیتا ہے ۔

(۴) اگر کسی قوم کی تخلیقی قوتیں اس کے افراد کے جذبات و احساسات تخیل اور وجدان ، قوت مشاہدہ اور عرفان کی بدولت رونما ہوتی ہیں، تو ادب ان قوتوں کو تیز تر کرنے اور ان صلاحیتوں کی جلا کے لئے کیا کرتا ہے ؟

اور اب اگر آپ ان ضمنی سوالات کے جوابات دیں تو ایسا معلوم ہوگا گویا ادب اور فن کو زندگی پر فوقیت حاصل ہے اس لئے کہ زندگی کو نکھارنے اور اسے اعلی سطحوں پر لیجانے کا کام ادب ہی سرانجام دیتا ہے ۔ یورپ میں جب " ادب برائے ادب " کے دعویداروں نے اس زاویہ سے زندگی کو دیکھا تو انہیں زندگی ادب کے مقابلے میں پست و حقیر نظر آنے لگی ۔ ادبی سرگرمی

زندگی کی دوسری سرگرمیوں کے مقابلے میں اعلی و ارفع معلوم ہوئی اور پھر کسی نے ادب کی بلندیوں سے زندگی کی پستیوں کو دیکھا تو یہ محاکمہ صادر کیا کہ " اگر یہی زندگی ہے تو ہمارے ملازم بھی ہمارے لئے جی لینگے "

آپ نے دیکھا ، ادب اور زندگی کے رشتوں کو زندگی اور ادب کی دو مختلف سمتوں سے دیکھنے کا نتیجہ دو مختلف نظریات کی صورت میں رونما ہؤا۔ جنہوں نے ادب کو زندگی کی طرف سے دیکھا وہ زندگی کو مقصد اور ادب کو ذریعہ سمجھنے لگے ، اور "ادب برائے زندگی" کے قائل ہوئے۔ اس کے برخلاف وہ جنہوں نے زندگی کو ادب کی طرف سے دیکھا وہ ادب کو مقصد اور زندگی کو ذریعہ سمجھنے لگے اور " ادب برائے ادب " کے قائل ہوئے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہردو نقطہائے نظر کے لوگ زندگی اور ادب کی دوئی کے قائل ہیں اور اسی لئے ان میں تضاد دیکھتے ہیں۔ دراصل ایسا نہیں ہے اگر وہ فی‌الواقعی زندگی اور ادب کی دوئی کے قائل ہوتے تو زندگی کو زندگی اور ادب کو ادب رہنے دیتے۔ وہ ادب اور زندگی میں تضاد تو ضرور

دیکھتے ہیں مگر تضاد کو حل کرنے اور دوئی کو
اکائی میں ضم کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ادب
برائے زندگی والے ادب کو زندگی بنانے کی سعی کرتے
ہیں اور ادب برائے ادب والے پوری زندگی کو ادب
بنا دینا چاہتے ہیں ۔ تضادات کو حل کرنے اور
دوئی کو اکائی میں تبدیل کرنے کی کوشش رومانوی
ذہن کی خصوصیت ہے ۔ ''ادب برائے زندگی،،
کا نظریہ رومانوی حقیقت پسندی (*Romantic*
Realism) کا نتیجہ ہے اور ''ادب برائے ادب،، کا نظریہ
رومانوی عینیت پرستی (*Romantic Idealism*) کی
پیداوار ہے ۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے، اور شاید آپ بھی اس بات میں
میرے ہم خیال ہوں کہ زندگی اور ادب دونوں اپنی اپنی
جگہ علیحدہ علیحدہ واضح حقیقتیں ہیں ، جن میں آپس
کے لین دین اور مماثلتوں کے باوجود تضاد موجود ہے ،
اور جو ایک دوسرے کا بدل نہیں ہو سکتیں ۔ ان دو
حقیقتوں کے تضاد کو حل کرنے کی کوشش ایسی ہی
ہے جیسے روشنی اور اندھیرے کے تضاد کو حل کرنے
کے لئے روشنی اتنی تیز کر دی جائے کہ آنکھیں چندھیا

جائیں — مجھے معاف کیجئے ، میں نے زندگی اور ادب
کے تضاد کو واضح کرنے میں ذرا جلد بازی سے کام
لیا ہے - دراصل یہ بات آج کی نہیں ہے - زندگی اور ادب
کی کشمکش بہت پرانی ہے اور اس کی جڑیں عہدقدیم تک
جاتی ہیں - مختلف زمانوں میں ادب اور شاعری کے خلاف
احتجاج بلند ہوتے رہے ہیں - کبھی فلسفہ کے نام پر ،
کبھی اخلاقیات کے نام پر ، کبھی سیاست کے نام پر
اور کبھی عملی زندگی کے نام پر ——— اور یہ بات کہ
" ادب برائے ادب " کے مبلغین نے مدافعتی کارروائی کو
ترک کر کے زندگی پر براہ راست حملہ شروع کردیا
تو یہ بات اردو ادب میں تو بالکل ہی نئی ہے اور
یورپ میں انیسویں صدی کے اواخر سے شروع ہوئی —

ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ زندگی اور ادب
کے تضاد کی بنیاد عقل اور جذبہ کے تضاد پر ہے - یوں
کہیے کہ ایک طرف تو عقل و شعور ، فکری اور تنظیمی
اصول زندگی ہے اور دوسری طرف جذبہ ، تخیل ، وجدان
اور تخلیقی اصول زندگی ہے - یہی وجہ ہے کہ فلسفہ ،
اخلاقیات اور سیاست نے جو فکری و تنظیمی اصول زندگی
کے تابع ہیں ، ادب وفن کو ، جن میں جذبہ ، تخیل ، وجدان

یا تخلیقی اصول زندگی کا بھرپور اظہار ہوتا ہے ، ہمیشہ اپنا حریف گردانا ۔ اور یہی وجہ ہے کہ افلاطون اور مولانا حالی دونوں تخلیقی اصولوں سے خائف سے نظر آتے ہیں اور انہیں تنظیمی اصولوں کے تابع بنانا چاہتے ہیں ۔ اور اب اگر آپ جذبہ کو عقل کا حریف مانتے ہوئے ، جذبے کی طرف آگئے تو آپ صوفی ہو جائیں گے اور اگر دوسری طرف چلے گئے تو نیچری یا کم از کم عقلیت پرست ہو جائیں گے اور پھر سید احمد خاں کی طرح یہ کہیں گے کہ الفاظ کو محض مطالب و مفاہیم کی ادائیگی کے لئے استعمال کرنا چاہئے ۔ یعنی استعارے کا خوف ۔ اور اگر سید احمد خاں کے برخلاف استعاروں اور علامتوں کے گورکھ دھندے میں پھنس گئے اور انہیں مقصود بالذات سمجھنے لگے تو جدیدترین شاعری پیدا ہوگی ۔ یعنی مطالب و مفاہیم سے عاری ۔

خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ ہوا ۔ میں تو اس تضاد کی بات کر رہا تھا جو ایک طرف جذبہ، تخیل اور وجدان اور دوسری طرف عقل و فکر کی صورت میں موجود ہے اور اسے میں ادب اور زندگی کے تضاد کی بنیاد بتا رہا تھا یوں کہ زندگی کو منظم کرنے اور اسے سمجھنے کا کام

عقل و فکر اور خیالات و نظریات کرتے ھیں ، جنھیں میں زندگی کے ”تنظیمی اصول“ کا نام دیتا ھوں ۔ ادب کے اساسی عناصر ، جذبہ ، تخیل اور وجدان ھیں اور انھیں میں ”تخلیقی اصول زندگی“ سے موسوم کرتا ھوں — اور اب آپ جذبہ اور عقل کے تضاد اور کشمکش کو ، ادب اور زندگی کے تضاد اور کشمکش کو ، ”تخلیقی اصول زندگی“ اور ”تنظیمی اصول زندگی“ کا تضاد اور کشمکش سمجھ لیں ۔

میں نے خواہ مخواہ مسئلے کو پیچیدہ بنا دیا ھے ، میں آپ سے اس کی معافی چاھتا ھوں — دو سیدھے سادے جملوں میں بات اتنی سی ھے کہ ادب اور زندگی کے رشتہ کا ایک پہلو منفی ھے یعنی تضاد اور کشمکش — مگر بات یہیں ختم نہیں ھوتی — میں آپ کو ایک اور الجھن میں ڈالنے چلا ھوں اور وہ یوں کہ اب میں ایک بالکل مختلف بات کہنے لگا ھوں — آگے بڑھنے سے پہلے پانچ باتیں ذھن نشین کر لیجئے ۔

(۱) کسی چیز کی تشکیل و تخلیق میں [یعنی ھر اس چیز میں جس کی کوئی متعین صورت اور ھیئت (Form) ھو] تنظیمی اصول ذریعہ اور تخلیقی اصول مقصد ھوتا

ہے۔

(۲) عملی زندگی میں اشیا بطور ذریعہ استعمال ہوتی ہیں اس لئے اس میں تنظیمی اصول کی برتری لازم ہے

(۳) ادب و فن اور دیگر تہذیبی سطحوں پر اشیا میں (یعنی شاعری ، مصوری ، اور رسومات (Rituals) وغیرہ میں) ذریعہ اور مقصد یکجا ہو جاتے ہیں ۔

(۴) ہر تخلیق میں (جس کی کوئی صورت و ہیئت (Form) ہو) تنظیمی و تخلیقی اصولوں کا اختلاط اور ارتباط ضروری ہے ۔

(۵) جس چیز کو جتنا زیادہ بطور ذریعہ استعمال کیا جائیگا اس میں اتنا ہی تنظیمی اصول حاوی ہو گا اور جتنا اسے مقصود بالذات سمجھا جائیگا اتنا ہی تخلیقی اصول حاوی ہو گا ۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں اب ایک مختلف بات کہنے جا رہا ہوں ۔ زندگی اور ادب دونوں ہی میں ہمیں مختلف شکلیں ، مختلف صورتیں اور ہیئتیں (Forms) نظر آتی ہیں ہر صورت اور ہیئت کی تخلیق چاہے وہ زندگی میں ہو یا ادب میں ، تنظیمی و تخلیقی دونوں اصولوں کے اختلاط اور ان کی مکمل

ہم آہنگی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ تنظیمی و تخلیقی اصولوں کا رشتہ مرد اور عورت کا رشتہ ہے اور زندگی اور ادب دونوں میں ہر نئی صورت اور ہر نئی ہیئت ان دو اصولوں کے اختلاط کا نتیجہ ہے* آپ کو یاد ہو گا میں پہلے یہ کہہ چکا ہوں کہ ادب اور زندگی کا رشتہ ، تخلیقی اور تنظیمی اصول زندگی کا رشتہ کشمکش اور تضاد پر مبنی ہے — اور اب میں یہ کہہ رہا ہوں کہ مختلف ہیئتوں (Forms) کی تشکیل و تخلیق میں یہ دو اصول ہم آہنگ ہو جاتے ہیں — اب آپ ان دونوں باتوں کو یکجا کر لیں — یعنی اب پوری بات یہ ہوئی کہ ادب اور زندگی کے رشتہ کا ایک پہلو منفی ہے اور ایک مثبت۔ منفی پہلو کے اعتبار سے ادب اور زندگی کا رشتہ آپس کے تضاد اور کشمکش پر قائم ہے — مثبت پہلو کے اعتبار سے یہ رشتہ ہم آہنگی اور اختلاط پر مبنی ہے —

II

اب میں اس نظریاتی بحث سے ہٹ کر دو چار

---

*میں نے اپنے اکثر مضامین میں تنظیمی اصول زندگی کو ''پدری اصول'' اور تخلیقی اصول زندگی کو ''مادری اصول'' بھی کہا ہے۔ اکثر احباب کسی نفسیاتی الجھن (COMPLEX) کے باعث ان اصطلاحات سے خوفزدہ رہتے ہیں۔

سیدھی سادی باتیں کہنا چاھتا ھوں ــ بالعموم ادب
کی تعریف کرتے ھوئے ھم اسے زندگی کے حوالے سے سمجھنے
کی کوشش کرتے ھیں ــ اس بات میں چنداں قباحت
نہیں - لیکن یہ بھی تو ھو سکتا ھے کہ ھم زندگی کو
ادب کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کریں - دراصل
ادب اور زندگی کے رشتے کو بخوبی سمجھنے کے لئے یہ
دونوں طریقے بیک وقت ضروری ھیں - اب تک یہ ھوتا
آیا ھے کہ جب زندگی کے حوالے سے ادب کو سمجھنے
کی کوشش کی گئی اور اسے ادب کے مقابلہ میں اھم
سمجھا گیا تو اکثر ادب پروپگنڈے کے حدود میں
داخل ھو گیا - اور جب زندگی کو ادب کے حوالے
سے سمجھنے کی کوشش ھوئی اور ادب کو زندگی پر
مقدم سمجھا گیا تو ادب زندگی سے علیحدہ ھو کر
تجریدی شکل اختیار کر گیا - زندگی ادب سے بے نیاز
ھو تو بنجر اورغیر تخلیقی ھو جاتی ھے- ادب زندگی سے
ماورا ھو تو بے جان ھیئت اور مردہ لاش بن جاتا ھے -
ظاھر ھے کہ ایسی صورت میں زندگی اور ادب دونوں
بے معنی ھوں گے - آئیے اب ھم یہ دیکھیں
کہ ادب اور زندگی دونوں ایک دوسرے کو کیا دیتے

ھیں اور ایک دوسرے سے کیا لیتے ھیں -

ہر دور اور ہر عہد میں دو قسم کی تاریخیں رقم ہوتی ھیں کسی معاشرے کی عقلی و فکری تاریخ اس کی سیاست ، اس کے قوانین ، اخلاقی ضابطوں اور معاشی عوامل سے اخذ کی جاتی ھے - لیکن احساس کی تاریخ اس معاشرے کے مذھب ، ادب اور فن میں مضمر ہوتی ھے - عقل و فکر کی تاریخ دور کے خاتمے اور معاشرے کی بے ترتیبی کے ساتھ ختم ھو جاتی ھے - سیاست ، قانون ، اخلاقی ضابطے اور معاشی عوامل محض یاد داشت کی صورت میں باقی رھتے ھیں - لیکن احساس ادب و فن کے حوالے سے زندہ رھتا ھے اور ہر عہد میں موثر اور محرک ثابت ھوتا ھے - ایک اور طرح دیکھئے تو عقلی و شعوری تاریخ کے پیچھے بھی احساس اور جذبے کی قوت ھوتی ھے - جب عقل و شعور اور جذبہ و احساس کا تضاد شدید ھو جاتا ھے تو افراد کی ذات کی طرح معاشرہ بھی ٹوٹنے اور بکھرنے لگتا ھے - افراد کی ذات میں جذبے اور عقل کی کشمکش اور ان کا شدید تضاد ان کی مجتمع شخصیت کے دو ٹکڑے کردیتا ھے اور اس طرح ان کا ذھنی توازن بگڑ جاتا ھے -

معاشرے میں بھی یہی ہوتا ہے کہ جب اجتماعی شعور اجتماعی لاشعور سے ، اجتماعی عقل اجتماعی احساس سے ہم آہنگ نہیں رہتی تو پورا معاشرہ پاگل ہو جاتا ہے ، اس کا توازن بگڑ جاتا ہے۔

معاشرے میں ادب کا رول یہ ہے کہ وہ اجتماعی شعور اور اجتماعی لا شعور کے درمیان رابطہ اور یگانگت قائم رکھتا ہے۔ معاشرے کی صحت کے لئے اس کے نظم و ضبط اور توازن کو برقرار رکھنے کیلئے ادب وہی کام سرانجام دیتا ہے جو فرد کی زندگی میں خوابوں کا ہوتا ہے۔ افراد کی زندگی میں خواب تنظیم ذات کا کام کرتے ہیں اور معاشرے کی زندگی میں یہ کام ادب کرتا ہے گویا ادب معاشرے کا خواب ہے۔

آپ نے ادب کی ایک تعریف جو زندگی کے حوالے سے کی جاتی ہے بارہا سنی ہو گی اور وہ یہ کہ ادب زندگی کا عکاس ہے یا یہ کہ ادب فطرت کی تقلید ہے۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہوسکتے ہیں کہ ادب اپنے وجود اور اپنی بقا کی خاطر زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ فطرت کی تقلید کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ کسی حد تک صحیح ہو مگر صرف کسی حد تک ، ایک

اور زاویہ سے دیکھئے تو اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ زندگی اور فطرت دونوں اپنی اعلی ترین سطحیں اور اپنے اعلی ترین قوانین کو معین صورت میں دیکھنے کے لئے خود کو ادب میں پیش کرتے ہیں ۔ ادب عملی طور پر فعال نہیں ہوتا ، وہ صرف اپنے بخشے ہوئے تاثرات کے ذریعے عمل کی صورتیں پیدا کرتا ھے بالکل ایسے جیسے آئینہ عملی طور پر فعال نہیں ہوتا ۔ ادب کا آئینہ زندگی اور فطرت کی عکاسی کے لئے نہ تو خود ان کے پاس جاتا ھے اور نہ آپ ھی آپ وجود میں آتا ھے ۔ زندگی اور فطرت خود اپنی اعلی و حسین صورتیں ادب کے آئینے میں دیکھنے کے لئے خود کو اس آئینہ میں پیش کرتی ہیں اور اس طرح اپنی رونمائی کرتی ہیں ۔

ادب میں زندگی کا انتشار منظم اور منضبط صورت میں رونما ہوتا ھے ۔ یہ ایک تخلیقی کام ھے اس لئے کہ اس سے سانچے اور ہیئتیں وجود میں آتی ہیں ۔ اس کے ساتھ ھی یہ بھی ہوتا ھے کہ پرانے بے جان سانچے ادب میں نئے سرے سے ترتیب پاتے ہیں ۔ اور اب مجھے وہ مغربی ناقد یاد آرھا ھے جس نے یہ کہا تھا کہ ادب تنقید حیات ھے ۔ آپ نے دیکھا ، تنقید

صرف حسن و قبح کی دریافت اور قدر کے تعین کا نام نہیں ہے ، تنقیدعمل تخلیق کو آگے بڑھانے کانام بھی ہے

ایک رائج الوقت غلط فہمی یہ بھی ہے کہ ادیب معاشرے کا آلہء کار ہوتا ہے - میں خود بڑی حد تک اس غلط فہمی میں شریک ہوں - مگر ادیب معاشرے کا آلہء کار محض ان معنوں میں ہوتا ہے جن معنوں میں معاشرہ خود شاعراورادیب کا آلہ کار ہوتا ہے- ہوتا یہ ہے کہ شاعر اور ادیب معاشرے کے مروجہ طرز احساس سے اپنا طرز احساس بناتے ہیں - معاشرہ انہیں واقعات و حقائق ، تاثرات و واردات، یعنی ادب کے لئے خام مواد مہیا کرتا ہے - یہاں تک تو مسئلہ سیدھا سادہ ہے - اس کے آگے ایک پیچیدہ بات ہے اور وہ یہ کہ سیاسی، معاشی، معاشرتی تبدیلیاں یانظام مقدارکی تبدیلیاں تیزی سے ہوتی رہتی ہیں لیکن معاشرے کا نظام اقدار اتنی سرعت سے تبدیل نہیں ہوتا- اس طرح معاشرے کے مقداری نظام اور اقداری نظام میں ایک بعد پیدا ہوجاتا ہے — اس بعد کو کم کرنے اور نظام اقدار و نظام مقدار کو ہم آهنگ کرنے کا کام فلسفی،معلم اخلاق اورشاعر و ادیب کرتے ہیں—فلسفی صداقت کے نام پر ، معلم

اخلاق ، اخلاقیات کے نام پر اور ادیب حسن اور توازن کے نام پر اس ہم آہنگی کے لئے جد و جہد کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ادیب ، یعنی معاشرے کے حساس ذہن ، اس طرز احساس میں جو وہ معاشرے سے حاصل کرتے ہیں آہستہ آہستہ تبدیلی بھی کرتے جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو مقداری اور اقداری نظام میں توازن و تناسب قائم رکھنے کا کام ناممکن ہو جائے گا۔

طرز احساس کی یہ تبدیلی بالآخر تاریخی تبدیلی میں منتج ہوتی ہے۔ جس طرح مقداری تبدیلیاں اقدار اور طرز احساس پر اثر انداز ہوتی ہیں اسی طرح طرز احساس کی تبدیلی بھی معاشرے کو اس بات کے لئے مجبور کر دیتی ہے کہ وہ مقداری نظام کو طرز احساس کے ساتھ ، اقدار کے ساتھ ہم آہنگ کرے اور اس کوشش سے تاریخی واقعات جنم لیتے ہیں۔ لیجئے ۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم محض ایک دائرے میں گھوم رہے ہوں ۔ شاید کچھ ایسی ہی بات ہے۔ بہر کیف مجھے تو صرف اتنی سی بات کہنی تھی کہ اگر یہ صحیح ہے کہ شاعر اور ادیب معاشرے کے آلۂ کار ہوتے ہیں تو یہ بھی

صحیح ہے کہ معاشرہ خود شاعروں اور ادیبوں کا آلۂ کار ہوتا ہے معاشرے نے علامہ اقبال کو پیدا کیا اور علامہ اقبال نے معاشرے کو پیدا کیا۔

ایک اور طریقہ سے دیکھئے تو ادب اور زندگی کا ایک رابطہ زبان کے ذریعے ہوتا ہے ــ زبان ، معاشرے میں استعمال ہونے والے آلات و اوزار کی طرح معاشرے کی تخلیق بھی ہے اور معاشرے کی خالق بھی ــ ادب اپنا اظہار زبان کے واسطے سے کرتا ہے اور اسی واسطے سے وہ معاشرے کی تخلیق بھی ہوتا ہے اور اس کا خالق بھی ــ زبان ایک طرف تو اجتماعی شعور کو فطرت کے ساتھ مربوط کرتی ہے اور دوسری طرف اجتماعی لاشعور (داخلی فطرت؟) اور اجتماعی شعور کے درمیان سفارت کا کام کرتی ہے ۔ دراصل کسی معاشرے کے وجود کی بنیادی شرطیں آلات‌واوزاراور زبان‌ہیں۔ آلات‌واوزارانسان کو محض مقداری و مادی زندگی سے متعلق کرتے ہیں لیکن زبان کا عمل دو گونہ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے معاشرے کے افراد کا تعلق مقداراور اقدار دونوں سے قائم رہتا ہے ۔ زبان کا مقداری رابطوں کے لئے استعمال اسے عامیانہ اور سطحی بنا دیتا ہے ۔ شعوری اور فکری

سطح پر زبان ساکن منجمد اور محدود ہو جاتی ہے ، ''علامت ،، کے بجائے محض ''نشان ،، بن جاتی ہے ۔ اس کے برخلاف جذبہ ، احساس ، تخیل اور وجدان کی سطح پر یا بہ الفاظ دیگر ادبی و شعری سطح پر زبان متحرک رہتی ہےاور اسمیں معانی و مفاہیم کی مختلف سطحیں قائم رہتی ہیں ، ۔ اس طرح ادب زبان کو وسیع ، عریض ، رفیع و دلکش بنانے کا کام سرانجام دیتا ہے ۔ سائنس اور فلسفہ میں ، ساتھ ہی معاشرے کے روزمرہ کے کاموں میں زبان مقررہ مفاہیم اور معین اشاروں کے لئے استعمال ہوتی ہے ، اس طرح وہ منجمد ہو کر گھس پٹ جاتی ہے ، فرسودہ ہو جاتی ہے ۔ ایک اور بات اور وہ یہ کہ سائنس اور فلسفہ میں زبان کا استعمال محض خاص مفاہیم کے لئے ہوتا ہے اور اسی لئے لفظوں کو ان کے صوتی و صوری تاثرات اور استعاراتی سطح سے ہٹا کر صرف معنی اور مفہوم کی سطح پر استعمال کیا جاتا ہے ۔ یعنی یہ کہ لفظوں کا تعلق ٹھوس اشیا سے منقطع ہوجاتا ہے اور انہیں تجریدی طور پر استعمال کیا جاتا ہے ۔ ادب لفظوں کے لئے زندگی بخش یوں ہوتا کہ وہ الفاظ اور ٹھوس اشیا کے

رابطے کو استوار کرتا ہے۔ کسی مغربی ادیب نے کہا ہے کہ الفاظ روزمرہ کے استعمال سے اسی طرح میلے اور بھدے ہو جاتے ہیں جس طرح سکے اور نوٹ مختلف ہاتھوں سے گذر کر ٹوٹ جاتے ہیں، میلے ہو جاتے ہیں۔ پس ادب وہ بینک ٹھہرا جہاں سے الفاظ تازے اور نئے ہو کر نکلتے ہیں۔ لیجئے بات جہاں سے شروع ہوئی تھی پھر وہیں آگئی — نوٹ، سکے، اور بینک — آپ نے دیکھا مقداری زندگی کے تقاضے بھی کتنے شدید ہیں —

اردو بحیثیت قومی زبان

ڈاکٹر وحید قریشی

پاک و ہند میں اردو زبان کا مسئلہ انیسویں صدی میں زبان سے گزر کر سیاسی مسئلے کی حیثیت سے نمودار ہوتا ہے۔ اردو ہندی کی سیاسی گروہ بندیوں میں زبان کسی نہ کسی حیثیت سے سیاسی سطح پر باہمی آویزش کا سبب رہی۔ سرسید کے زمانہ میں اردو ہندی کے مسئلے کی شکل و صورت واضح طور پر سامنے آئی۔ پھر دو قوموں کے نظرئیے نے ہند و پاکستان میں سیاسی حالات کو ایک نئی شکل میں ڈھال دیا۔ ہندی ہندوستانی اور اردو کے الفاظ محض لسانی مسائل نہ تھے۔ ان کے پیچھے بعض دوسرے سیاسی اور تمدنی مسائل بھی کار فرما تھے۔ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد مغربی پاکستان میں اردو کی حیثیت کو متعین کرنے کا سوال بار بار اٹھتا رہا۔ پاکستان کی تاسیس نظریاتی بنیادوں پر ہوئی۔ اور اب زبان کا مسئلہ بھی اسی نقطہ نظر کی روشنی میں ہمارے سامنے آیا۔ اردو کی قومی زبان کے بارے میں ابتدا ہی سے ایک دو باتوں کو ذہین نشین کرنا ضروری ہے۔ اول یہ کہ پاکستان کی مملکت ان جغرافیائی بنیادوں پر استوار نہیں جو قومیت کے مغربی تصور نے پیش کیا ہے۔ اسلام

میں لسانی ، نسلی اور علاقائی وحدت کا وہ تصور موجود نہیں ہے ۔ جسکی بناء پر ہندی ، چینی ، انگریز، جرمن ، فرانسیسی اور امریکی اقوام جداگانہ قومی حیثیتیں رکھتی ھیں ۔ دوم یہ کہ اسلام میں زبان ، نسلی امتیاز اور ایسی ھی دوسری وحدتیں کوئی اعتقادی درجہ نہیں رکھتیں ۔ یوں حب الوطنی کا جذبہ اپنی نفسیاتی اور انسانی سطح پر برمحل اور بجا ھے ۔ لیکن اسلام جس ھیئت اجتماعیہ کی تشکیل کرتا ھے ۔ اس میں وطنیت کے اس مغربی تصور کے لئے کوئی جگہ نہیں ۔ جو مذھبی بنیادوں پر ملت کو ایک لڑی میں پرونے سے روکتا ھو ۔ گویا قومیت کا تصور جب سیاسی نظریہ بنتا ھے تو اسکا براہ راست تصادم اسلامی طرز حیات اور اسلامی طرز فکر سے ھوتا ھے ۔ ملت اسلامیہ مذھبی بنیادوں پر معاشرے کی تشکیل و تعمیر کی ضامن ھے ۔ مختلف علاقوں کے افراد کی پہچان اور ایک جغرافیائی اصطلاح کے طور پر قوم کا لفظ اسلام سے تو متصادم نہیں ۔ وطن کی محبت ایک فطری جذبہ ھے ۔ لیکن جہاں وطن جغرافیائی اصطلاح سے گزر کر سیاسی تصور کے طور پر ھمارے سامنے آتا ھے ۔ اسلام کے اصولوں سے

براہ راست اس کا تصادم ہو جاتا ہے ۔ اس لحاظ سے پاکستان میں اردو زبان کی قومی حیثیت کا دائرہ عمل بھی بدل جاتا ہے ۔ یہ تذکرہ بھی شائد بے موقع نہ ہو گا ۔ کہ زبانوں کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ کیا رہا ہے ۔ مسلمانوں کے نزدیک زبان اظہار کا وسیلہ ہے ۔ دنیائے اسلام کے مختلف خطوں میں مختلف زبانیں رائج رہی ہیں اور آج بھی ہیں ۔ کلام پاک عربی زبان میں نازل ہوا ۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کی علمی اور مذہبی زندگی کے لئے اسکی اہمیت ہر زمانے اور ہر دور میں قائم رہی ۔ جب ایران میں اسلام کو فروغ حاصل ہوا تو خود عربی علم و ادب میں ایرانیوں نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیئے کہ اگر آج ان کی تحریروں کو عربی ادب سے خارج کر دیا جائے ۔ تو اس کا سب سے اہم اور قابل قدر حصہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے ۔ جب مسلمانوں کے قدم ہند و پاکستان کی سر زمین پر پڑے تو یہاں بھی دینی علوم کی ترویج میں عربی زبان کو تفوق اور برتری حاصل رہی ۔ لیکن تاریخ اسلام کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم اسلام کے مختلف حصوں میں

کبھی بھی لسانی بنیادوں پر کوئی سیاسی مسئلہ نہیں
اٹھا - ایران میں عربی کی علمی برتری کے باوجود فارسی
زبان کی ترقی ہوتی رہی - اور اس کے جلو میں مختلف
مقامی بولیاں پنپتی رہیں - لیکن زبان کی بنیاد پر عصبیت
کا کوئی اظہار نہیں ملتا اسی طرح ماوراءالنہر اور ترکی
میں ترکی زبان کو عربی کے بعد اہمیت حاصل ہوئی -
ہندوستان میں بھی عربی کے دوش بدوش ابتداء ہی سے
فارسی دفتری، سرکاری اور بول چال کی حیثیت سے رائج
رہی - پھر اردو زبان کا بول بالا ہوا - مقامی بولیاں
اور مقامی زبانیں بھی اپنے اپنے طور پر ترقی کرتی رہیں
زبان مسلمانوں کے لئے کسی عصبیت یا محدود جغرافیائی
وطنیت کا وسیلہ نہیں رہی - اسلام نے ہمیشہ اس طرح
کی محدود ذہنیت اور تنگ نظری کی مخالفت کی ہے -
ہر علاقے کے اعتبار سے زبانوں کا مسئلہ درجہ بندی کے
ایک مقررہ اصول کے مطابق طے ہوتا رہا ہے - مذہبی
لحاظ سے عربی زبان کی تعلیم اور ترقی ہمیشہ مسلمانوں
کے نزدیک بنیادی حیثیت رکھتی ہے - اسکے بعد
عالم اسلام میں علمی اور ادبی زبان کے طور پر فارسی کو
اہمیت دی گئی - اس کے بعد ہر ملک کے اعتبار سے اس

ملک کی زبان کا درجہ آتا ہے - جس میں کاروباری ، دفتری معاشرتی اور تعلیمی ضروریات پوری ہوتی ہیں - علاقائی زبانوں کا نمبر اس کے بعد آتا ہے - مسلمانوں کی تاریخ کو ابتدا سے لیکر آجتک دیکھ جائیے - زبانوں کی یہ درجہ بندی ہر دور میں قائم رہی ہے - جب اردو کو بحیثیت قومی زبان اپنانے کا سوال اٹھتا ہے - تو اس میں یہی بنیادی نقطہ نظر سامنے رکھنے کی ضرورت ہے - اسلام نے مختلف ملکوں کی زبانوں کو برقرار اور بحال رکھا - لیکن اسے اسلامی معاشرے کے بنیادی رجحانات سے متصادم ہونے سے روکا - قومی زبان کو جب مغربی قومیت کی بنیاد بنا کر نسلی اور جغرافیائی بنیادوں پر استوار کیا جاتا ہے - تو یہ مسئلہ محض زبان اور اس کے استعمال کا مسئلہ نہیں رہتا - اس کی براہ راست زد اسلام کی ہیئت اجتماعیہ پر پڑتی ہے - اسی طرح جب لسانی بنیادوں پر قومی اور ملکی زبانوں کی جگہ علاقائی زبانوں کو لانے کی کوشش کی جاتی ہے - تو اس سے علاقائیت کا وہ فتنہ برآمد ہوتا ہے جو قومی یکجہتی ہی کے منافی نہیں بلکہ اسلام کی فکری اساس کو بھی متزلزل کر دیتا ہے - زبان اگر اظہار کا وسیلہ ہے - تو

اسلام اس کے رستے میں حائل نہیں بلکہ اسکی ترویج و ترقی اور اسے ملی زندگی کی تشکیل میں پوری طرح بروئے کار لانے کی تدبیریں کرتا ہے۔ لیکن اگر نظریاتی اعتبار سے لسانی مسائل ملت اسلامیہ کی یکجہتی پر اثر انداز ہوں۔ تو پھر زبان کی حیثیت ایک سیاسی آلہ کار کی ہو جاتی ہے۔ اور اسلام ایسے نظریات کے خلاف ہے۔ اردو زبان کو جب ہم قومی حیثیت دینا چاہتے ہیں۔ تو اسے وطنیت کے تصورات اور علاقائی عصبیت سے الگ کر کے دیکھنا نہایت ضروری ہے۔ شعوبی، قبائلی، نسلی، لونی اور لسانی امتیازات اسلام کی روح کے خلاف ہیں۔ زبانوں کا مسئلہ اگر اس پس منظر سے ابھرتا ہے۔ تو وہ اسلام کے پیش کردہ قومی تصور سے ہم آہنگ نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ زبانوں کی اس درجہ بندی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے بھی ہم اردو زبان کی ترویج و ترقی کے لئے جدوجہد نہ کریں ہماری جدوجہد آزادی میں زبان کا مسئلہ کسی مخصوص خطے کا مسئلہ نہ تھا۔ بلکہ اردو کو ہم نے ایک زندہ حقیقت کے طور پر قبول کیا ہے دو قوموں کے نظریے کو اپناتے ہوئے ہم نے پاکستان کے لئے زبان کے مسئلے کو ایک جداگانہ

زاویے سے دیکھا ہمارے لئے اردو زبان ہمارے ملی افکار
کی ترویج کا ذریعہ اور پاک و ہند کے مسلمانوں میں
اسلامی تعلیمات کی ترقی کا ایک بڑا وسیلہ تھی -
پاکستان کے لئے اردو زبان کی قومی حیثیت جدوجہد
آزادی کے لئے بنیادی مقاصد میں شامل تھی - اردو زبان کی اس
سیاسی حیثیت میں اور مغرب کے لسانی وحدت کے تصور میں بین
فرق ہے - عالم اسلام کے پس منظر میں اور پاک و ہند کی
جہدوجہد آزادی کے تناظر میں اردو کی قومی حیثیت
کا مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے - اردو کو قومی زبان
قرار دیکر مغرب کے تصور قومیت کو رائج کرنا یا اسکی
داغ بیل ڈالنا ملی عزائم اور اسلامی تصور حیات کے
بالکل خلاف ہوگا - اردو کو بحیثیت قومی زبان ہمیں
جو درجہ دینا ہے - اس میں اردو کی حیثیت ایک ایسی
قومی زبان کی ہے - جس میں مسلمانوں کا بیشتر علمی
اور فکری سرمایہ محفوظ ہے - جس جس ملک میں اسلام
پہنچا وہاں کاروباری ، معاشرتی ، دفتری ، تعلیمی اور ادبی
مسائل میں قومی زبانوں ہی کو اہمیت دی گئی -

اردو کو بحیثیت قومی زبان رائج کرنے کے لئے
ان تمام حیثیتوں سے اسے اس کا مناسب حق دینے کی
ضرورت ہے - اس مرحلے پر مادری زبان کی ترکیب کا

تذکرہ بھی شائد بے موقع نہیں ہو گا - کیونکہ ادھر چند برس سے جہاں قومیت کا مغربی تصور فکری و حدتوں کو پارہ پارہ کرنے کے لئے بر سرعمل تھا - وہاں خود قومیت کے تصور کو مزید چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے لئے علاقائیت کا تصور ابھرا - جغرافیائی اور لسانی وحدتیں بھی مضبوط سلطنتوں کا پیش خیمہ بنتی جا رہی تھیں - ان وسیع حلقوں کو اور زیادہ تنگ کرنے کے لئے علاقائیت کے تصورات جاگے - ان چھوٹی وحدتوں کے لئے نسلی اور جغرافیائی حد بندیاں کار آمد نہیں ہوسکتی تھیں - اس لئے لسانی بنیاد کو ایک نئی شکل میں پیش کیا گیا - پاکستان کو جہاں ایک طرف مغربی قومیت کے تصور سے خطرہ لا حق ہے - دوسری طرف علاقائیت کے تصورات بھی اس کے لئے حد درجہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں - زبان کے اس قومی تصور کی روشنی میں جو تاریخ اسلام ہمیں عطا کرتی ہے - علاقائی زبانوں کی حیثیت اپنی جگہ پر محفوظ ہے - بشرطیکہ ان کی مدد سے کوئی سیاسی کام نہ لیا جائے - نیز زبانوں کی اس درجہ بندی کو ضعف پہنچانے کی کوشش نہ کی جائے - جو اسلام نے ہر ملک اور ہر علاقے میں قائم رکھی

ھے - عالم اسلام میں عربی کی برتری کو بھی اس لحاظ
سے مختلف علاقوں پر مسلط نہیں کیا گیا - کہ وہ
ملکی زبان کی جگہ لے لے- زبانوں کا اپنا فطری عمل ھمیشہ
بروئے کار رھا - اسلام نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا -
عربی کو ایک علمی اور دینی زبان کی حیثیت سے تسلیم
کیا گیا - لیکن برتری کے کسی مریضانہ احساس کے زیر
اثر کسی علاقہ میں بھی عربی کو جبراً بول چال کی زبان
نہیں بنایا گیا - ایران میں عربی علمی و ادبی زبان تھی -
لیکن کاروباری ، دفتری اور دوسرے شعبہ ھائے زندگی
میں فارسی ھی کو اھمیت دی گئی - گویا ملکی زبانوں
کو بول چال اور تعلیم و تعلم کا وسیلہ بنایا گیا - عربی
کے ساتھ ایک تقدس کا پہلو البتہ ضرور قائم رھا - لیکن
زبانوں کے فطری عمل اور ان کے نشوونما کے خلاف
اسے کبھی استعمال نہیں کیا گیا -

مغربی پاکستان کے باشندوں کے لئے اردو کی حیثیت
قومی زبان کی ھے - اس لئے اسے ذریعہ اظہار کا وسیلہ
ھونا چاھئیے - قومی زبان کے بعد ھماری فکری زندگی
کے لئے جن زبانوں کی سب سے زیادہ ضرورت ھے - ان میں
عربی اور فارسی کی اھمیت مسلم ھے - ھم مغربی علوم

اور مغربی زبانوں سے بھی روگردانی نہیں کرسکتے ۔ اب
یہ ہمارے ماہرین تعلیم کا کام ہے ۔ کہ ہماری تعلیمی
زندگی میں زبانوں کے توازن کو برقرار رکھتے ہوئے
عربی اور فارسی کو ان کا حق عطا کریں ۔ اس سے اردو
کی حیثیت بھی مضبوط ہوگی ۔ اور پاکستان کے باشندوں
کی ذہنی تربیت بھی صحیح خطوط پر ہو سکے گی ۔ جب
ہم اردو کو قومی زبان کا درجہ دلانا چاہتے ہیں ۔ تو
ہمارے نزدیک اردو کے لئے وہ مقام ہے ۔ جو ابتک
انگریزی نے حاصل کر رکھا تھا ۔ کاروباری ، معاشرتی
دفتری ، تعلیمی اور ادبی معاعلات میں انگریزی کی جگہ
اردو کو حاصل ہونی چاہئیے ، لیکن اردو کو اس
کا جائز حق اس وقت ملے گا جب ہماری ذہنیت بدلے
گی ۔ ہم نے نیا ملک تو حاصل کر لیا ہے ۔ لیکن تین
سو برس کی غلامی نے ذہنوں میں تقلید کا جو بیج بو
دیا ہے ۔ وہ ابھی تک پھل لا رہا ہے ۔ بعض لوگ
اردو میں اپنا نام تک لکھنا گوارا نہیں کرتے ۔ معاشرتی
زندگی میں ہر وہ آدمی جو انگریزی میں خط و کتابت
نہیں کرتا شائستہ مجالس میں انگریزی بولنے سے گریز
کرتا ہے ۔ اسے غیر مہذب سمجھا جاتا ہے ۔ کاروباری

زندگی میں بھی تمام خط و کتابت انگریزی میں کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے ۔ انگریزی لکھنا پڑھنا شائستگی کی علامت ہے ۔ اس کے مقابلے میں اپنی زبان کو گھٹیا سمجھا جاتا ہے ۔ دوکانوں پر سائن بورڈ بھی انگریزی ہی میں لکھے جاتے ہیں ۔ چاہے گاھکوں میں صرف دس فیصدی ان بورڈوں کا مفہوم اور مطلب سمجھتے ہوں ۔ غلامی کی زندگی اپنی ہر چیز کو گھٹیا اور آقا کی ہر چیز کو گراں قیمت بنا دیتی ہے ۔ اس کے لئے عام معاشرتی سطح پر پوری جد و جہد کی ضرورت ہے ۔ کیونکہ اس طرح کے رجحانات کے بر قرار رہنے سے آزادی کے صحیح نتائج مرتب نہیں ہوسکتے ۔ نجی اور گھریلو زندگی میں بھی ہمیں اپنی ملکی زبان کو اس کا مناسب مقام دینا چاھئیے کیونکہ یہ ہر ملکی زبان کا فطری حق ہے ۔ اسی طرح تعلیم میں بھی اردو کی قومی حیثیت کو برقرار اور بحال کرنے کی ضرورت ہے ۔ اس بات کا زبانی اقرار کافی نہیں ۔ بلکہ عملی طور پر بھی نظام تعلیم میں اردو کو رائج کرنے سے ہمارے دفتری نظام کی بڑی حد تک اصلاح ممکن ہے ۔ اس مرحلے پر یہ بات بھی شائد بے موقعہ نہیں ہو گی کہ انگریزی اور دوسری آریائی زبانوں میں

سائنسی موضوعات ، ادب اور معاشرتی علوم میں بے اندازہ
ترقی ہوئی ہے - ہمیں اس سے بھی پورا فائدہ اٹھانا
چاہئیے - انگریزی زبان کی تدریس بہر حال باقی رہنی
چاہیئے - اردو کی حمایت میں جب کچھ کہا جاتا ہے -
تو اسے لازماً انگریزی کی مخالفت سمجھا جاتا ہے -
حالانکہ یہ صورت حال نہیں - ہم انگریزی کو یہاں
ذریعہ تعلیم رکھنے کے مخالف ہیں - لیکن انگریزی کی
تعلیم کے مخالف نہیں ہیں - کسی زبان کی تدریس اور
بات ہے - لیکن اسے ذریعہ تعلیم بنا لینا بالکل جداچیز
ہے - یہ تبدیلی ظاہر ہے بعض مسائل سے دوچار کرتی
ہے - اصطلاحات کا مسئلہ ، نصابی کتب کا مسئلہ ،
ٹائپ کا مسئلہ ، رسم الخط کا مسئلہ ، یہ سبھی مسائل
اپنی جگہ اہم ہیں اور اردو کو ذریعہ تعلیم بناتے
وقت ان مسائل پر بھی غور و فکر ضروری ہے - لیکن
اب تک یہ معاملات ٹلتے رہے ہیں - انہیں عذر کے طور
پر استعمال کیا جاتا رہا ہے - اور ملکی زبان کو اس
کا جائز حق دینے کے راستے میں بہانے کے طور پر استعمال
کیا گیا ہے - اس لئے ملکی زبان کے حامی ان مسائل کے
اٹھانے والوں کی طرف سے کچھ بدظن سے ہوگئے ہیں -

اردو کو دفتری حیثیت دینے کے لئے بھی ایسے ہی حیلے بہانے تراشے جاتے ھیں - عدالتی زبان کے طور پر اردو مدتوں سے رائج ھے - صرف اسے اعلی عدالتوں تک لے جانے کی ضرورت ھے - دیہات میں پولیس اور دوسرے محکموں کا کاروبار اردو میں چلتا ھے - دفتری اصطلاحات کا مسئلہ ایک بڑی حد تک حل ہو چکا ھے - اب ضرورت ھے - کہ اس تمام مواد سے کام لیا جائے اور سرکاری سطح پر دفتروں میں اردو زبان کو رائج کر دیا جائے -

اردو زبان میں دخیل الفاظ کا مسئلہ

سہیل بخاری
(ایم-اے-پی-ایچ-ڈی)

دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں کسی دوسری زبان کے الفاظ نہ پائے جاتے ہوں - اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب دو قوموں میں ملاپ ہوتا ہے تو ان کی زبانیں بھی ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتی ہیں اور ایک دوسرے کے ذخیرے سے تھوڑے بہت الفاظ ضرور لے لیتی ہیں جو اپنے بیگانہ ماحول میں دخیل کہلاتے ہیں - ان کی اہمیت اس لئے مسلم ہے کہ یہ ہمیں دو قوموں کے تعلقات اور ان کی نوعیت (مذہبی، سیاسی ، فوجی ، سماجی ، وغیرہ) سے آگاہی بخشتے ہیں جو ماضی کے کسی عہد میں استوار ہوئے تھے اور یوں تاریخ عالم کے ان گوشوں کو روشن کرتے ہیں جو ابھی تک پردۂ تاریکی میں ہیں اور جن تک ہماری رسائی کے تمام وسائل ختم ہوچکے ہیں چنانچہ اس اعتبار سے کہ ازمنہ قدیم کے حالات کا سراغ لگانے کے لئے زبان اور زبان کے الفاظ ہی ہمارا واحد وسیلہ اور آخری سہارا ہیں دو قوموں کے ارتباط باہمی سے متعلق معلومات حاصل کرنے کیلئے دخیل الفاظ کی قدروقیمت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا -

ماضی کے کسی دور میں ہندوستان پر موجودہ روسی ترکستان کے آریہ قبائل کی ترک تاز اس برصغیر

کی تاریخ کا وہ اہم واقعہ ہے جس کے باعث دو قوموں (آریہ اور دراوڑ) میں ایک ایسا تصادم ہوا تھا کہ اس کے اثرات زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح آج ہندوستانی لسانیات میں بھی اچھی طرح محسوس کئے جا سکتے ہیں ۔ یہ وہ وقت تھا جب اردو زبان نے ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح پہلی بار آریوں کی آبائی زبان (اصطلاحاً اوستائی) کے حلقہ اثر میں آکر و ، ہ اور ی کی آوازیں قبول کی تھیں جو بادی النظر میں اس کا گوشت و پوست معلوم ہوتی ہیں لیکن ذرا سے تامل پر یہ بات کھل جاتی ہے کہ آریوں کے حملہ سے پہلے ہمالیہ کے اس پار کی زبانوں میں جنہیں بجا طور پر دراوڑی کہا جاسکتا ہے یہ آوازیں نہیں ملتی تھیں ۔ چنانچہ آج بھی ہماری زبانوں کا تلفظ جو ہزاروں سال سے زبانوں پر کمال صحت کے ساتھ منتقل ہوتا چلا آیا ہے پکارے گلے بتارہا ہے کہ یہ آریائی ملمع ہماری آواز کی ہلکی سی آنچ سے صاف اتر جاتا ہے ۔

مجھے یقین ہے کہ اسی زمانے میں اردو زبان نے بہت سے آریائی الفاظ بھی مستعار لے لئے ہونگے کیونکہ زبانوں میں آوازوں کے لین دین کا نمبر الفاظ

کے لین دین کے بعد آتا ہے لیکن اس زمانے کی ایسی کوئی دستاویزی شہادت اس وقت سامنے نہیں ہے جس سے اردو میں دخیل الفاظ کی قطعی تعداد کا اندازہ لگایا جاسکے۔ اردو اور اس کی معاصر زبانوں میں آج جو سنسکرت الفاظ پائے جاتے ہیں وہ آریوں کی بول چال سے نہیں آئے بلکہ ان کی تحریری زبان سنسکرت سے لئے گئے ہیں اس لئے ان کا جو تلفظ آج عام طور پر کیا جا رہا ہے ساقط الاعتبار ہے کیونکہ سنسکرت اور ویدک کی تحریروں میں قدیم ایرانی اور مختلف دراوڑی بھاشاؤں (بول چال کی زبانوں) کے الفاظ کتابت کے مخصوص اصولوں کے تحت درج کئے گئے اور اصول اولین شارح رگ وید یاسک متی کی تحریر کے مطابق زیادہ سے زیادہ چھ سو سال قبل مسیح تک عالموں کے حیطہ علم سے باہر ہو چکے تھے حالانکہ ان زبانوں میں یہ الفاظ حقیقت میں وہی ہیں جو آج ترکستان میں بولے جا رہے ہیں یا پاک و بھارت کی مختلف زبانوں میں رائج ہیں مثلاً

سرجنہار = فارسی سرزن ، اردو علامت فاعلی آر ، پیدا کرنے والا۔ آشا اردو آس۔ اوستائی علامت تانیث آ۔

جیون = ایرانی زیون ۔ سنگم = ایرانی ھم بمعنی ساتھ ۔ گم بمعنی چلنا = ھمقدمی ۔ گیان = ایرانی زان ، دان بمعنی علم ۔ ایشور = ایرانی ایزور بمعنی معبود ۔ گیانیشور — دانشور وغیرہ

اردو کے دخیل الفاظ پر دوبارہ غور کرنے کیلئے ھمیں اس زمانے کا انتظار کرنا پڑتا ھے جبکہ دسویں صدی عیسوی کے لگ بھگ مسلمانوں نے ھندوستان پر درہ خیبر کی راہ سے حملہ کیا اور ایرانی بول چال کی زبان دوبارہ ان کی ھم رکابی میں یہاں پہنچی ۔ یہ حملہ آور اپنے سے ھزاروں سال پہلے کے آریوں کی طرح زبان کے علاوہ اپنی لپی بھی ساتھ لائے تھے جس میں آگے چل کر یہاں کے مختلف علاقوں کی مقامی زبانیں قلم بند ھونے لگیں اور یوں اردو زبان بھی جو ان کی آمد سے قبل دیوناگری ھی میں لکھی جاتی تھی ایرانی لپی کے لباس میں آ گئی ۔ اور چونکہ فارسی ھند شمالی میں مسلمان حکمرانوں کی مادری زبان ھونے کے لحاظ سے سرکار دربار میں ۱۸۳۲ء تک مسند نشین رھی یہاں کی دوسری مقامی زبان میں بھی بیشمار فارسی اور فارسی کی وساطت سے عربی الفاظ داخل ھو گئے ۔

اس کے برعکس ہند جنوبی میں فارسی کو راج پاٹ کا کبھی موقع نہیں ملا بلکہ ابتدا ہی سے دکنی زبان اس منصب پر بڑے اطمینان و اعتماد کے ساتھ براجمان رہی جو اس کا پیدائشی حق تھا اس لئے دکن میں دخیل الفاظ کی تعداد، تلفظ اور املا وغیرہ مقامی اصول و قواعد کے پابند رہے جبکہ شمال میں اردو زبان عربی فارسی سے اس حد تک دب گئی کہ اس میں دخیل الفاظ کا تناسب دکنی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو گیا اور تلفظ و املا بھی قریب قریب اسی طرح جاری رہے جس طرح عربی فارسی میں تھے بلکہ ان زبانوں نے اردو میں اپنی بہت سی آوازیں بھی داخل کر دیں اور اس کے بہت سے الفاظ کو یوں تبدیل کر دیا کہ وہ اپنی ہی زبان میں دخیل نظر آنے لگے مثلاً پٹخنا (اصل پٹکنا) - چٹخنا (اصل چٹکنا) - اخروٹ (اصل اکھروٹ) - شراٹا (اصل سراٹا) زناٹا (اصل جھناٹا) - زپاٹا (اصل جھپاٹا) - خصم (اصل کھسم) - زق زق بق بق (اصل جھک جھک بک بک وغیرہ

عربی فارسی کے دخیل الفاظ کے متعلق اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ اردو کی بہت سی مروجہ فرہنگوں

اور تحریروں میں دیسی الفاظ کے مقابلے میں دخیل الفاظ کی تعداد آٹے میں نمک کے بجائے نمک میں آٹے کے مصداق نظر آتی ھے ۔ انشاءاللہ خاں کی ''رانی کیتکی کی کہانی،، اور آرزو لکھنوی کے دیوان ''سریلی بانسری،، کو چھوڑ کر جن میں دخیل الفاظ سے جان بوجھ کر اور کوشش کر کے دامن بچایا گیا ھے اور جنھیں دیسی زبان کی صلاحیتوں کو روشن کرنے کے لئے نمونہ بنا کر پیش کیا گیا ھے اردو زبان کے اس سرمائے کو جو فارسی لپی میں ھمارے سامنے موجود ھے اول سے آخر تک دیکھ جائیے تو یہی گمان گزرے گا کہ اردو زبان فارسی عربی سے نہیں تو کم از کم ان کی وساطت سے ضرور پیدا ھوئی ھے ۔ اس صورت حال سے زبان اردو کے بعض مورخین کی معذوری کا بھی پہلو نکلتا ھے جنھوں نے بول چال کی زبان کے بجائے اسی ادبی سرمائے پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھی ھے ۔

اس سلسلے میں ادب اردو کے چند نامور شعراء نے جن کی ابتدا حاتم اور مرزا مظہر جان جاناں سے ھوتی ھے اپنے اپنے زمانے میں جو کوششیں اصلاح زبان کے نام سے کی ھیں حقیقۃً اور عملاً تفریس شاعری کے نام سے موسوم

ہونا چاہیئے کیونکہ فارسی لپی میں منتقل ہونے کے بعد اردو شاعری دیسی عروض سے کٹ کر مکمل طور پر ایرانی شاعری کی لونڈی بن گئی تھی اور تفریس شاعری کو زیادہ سے زیادہ کامیاب اور مکمل بنانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ زبان کے دیسی الفاظ نکال نکال کر ان کی جگہ عربی فارسی کے زیادہ سے زیادہ لغات داخل کر دیئے جائیں - چونکہ شاعری ایک موثر پیرایہ بیان ہے اس لئے شعراء کی ان کوششوں سے اردو کے پڑھے لکھے طبقے کا اثر قبول کرنا ناگزیر تھا نتیجہ یہ ہوا کہ جس انشاپرداز نے بھی قلم ہاتھ میں اٹھایا اس نے اپنے پیش رو سے زیادہ عربی فارسی الفاظ اردو زبان میں داخل کر دیئے اور اب یہ حال ہے کہ ہم کٹھن سے کٹھن موقع پر بھی دخیل لفظ پیش کر سکتے ہیں لیکن دیسی لفظ پوچھئے تو بغلیں جھانکنے لگیں گے -

اردو کی تیسری بار ٹکر انگریزی زبان سے ہوئی جو مسلمانوں کے حملے کے تقریباً پانچ چھ سو سال کے بعد سات سمندر لانگھ کر انگریزوں کے ساتھ سورت کے بندرگاہ پر اتری - اگرچہ ولندیزی ، پرتگالی اور فرانسیسی زبانیں انگریزی سے پہلے یہاں آچکی تھیں

جن کے چند الفاظ اردو میں آج بھی ملتے ہیں پھر بھی اردو سے ان کا اتنا بلاواسطہ اور گہرا تعلق قائم نہیں ہوا جتنا انگریزی زبان سے ۔ اس لئے دخیل الفاظ کے سلسلے میں ان کی اتنی اہمیت بھی نہیں ہے ۔ ہندوستان میں انگریزوں کا دور حکومت تقریباً دو سو سال تک جاری رہا جس میں انھوں نے اپنی زبان کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچانے اور پھیلانے کی جان توڑ کوشش کی بلکہ ۱۸۳۲ء میں فارسی کی گدی چھین کر بظاہر جو انھوں نے اردو کو سرکاری زبان بنایا تھا اس میں بھی یہ مصلحت پوشیدہ تھی کہ اردو کی آڑ میں انگریزی کو راج سنگھا سن پر بٹھا دیں اور اس میں وہ اتنے کامیاب رہے کہ انھیں ہمارا ملک چھوڑے ہوئے سترہ سال ہوچکے ہیں لیکن انگریزی ابھی، تک جہاں کی تہاں جمی ہوئی ہے ۔ اس اتصال سے انگریزی کے بہت سے الفاظ اردو زبان میں داخل ہوئے جو آج خواص سے گزر کر عوام کی زبانوں پر بھی جاری ہیں ۔

غرض اردو دیوناگری لپی میں سنسکرت سے الفاظ لیتی رہی ۔ ایرانی لپی میں فارسی عربی لغات جذب کرتی

رھی اور آخر میں آ کر انگریزی سے بھی خوشہ چینی
کرنے لگی ۔ اس طرح ھماری زبان میں بے شمار دخیل
الفاظ جمع ھو گئے ھیں ۔ اس کی ایک وجہ یہ ھے کہ
جن لوگوں نے فارسی عربی یا انگریزی کا بہت زیادہ
مطالعہ کیا ھے وہ ان زبانوں میں بڑی آسانی کے ساتھ
اظہار خیال کر سکتے ھیں ۔ جب وہ اردو میں لکھنے
بیٹھتے ھیں تو وھی الفاظ جو ان کے ذھن میں گردش
کرتے رھتے ھیں اپنی تحریروں میں درج کر دیتے ھیں
اور یوں اردو زبان کے الفاظ تلاش کرنے کی زحمت سے
بچ جاتے ھیں ۔ یہ تن آساں لوگ عادتاً دخیل الفاظ
استعمال کرتے اور قصداً کدوکاوش سے کتراتے ھیں ۔
اسی جماعت میں ان لوگوں کا بھی شمار ھے جن کو
اردو کم آتی ھے ۔ وہ اپنی کمی کو اردو کے مزید
مطالعے کے بجائے دخیل الفاظ سے پورا کر کے کام
چلانے کی کوشش کرتے ھیں ۔

بعض لوگ صرف اس لئے دخیل الفاظ استعمال
کرتے ھیں کہ دوسروں پر اپنے علم و فضل کی
دھاک بٹھائیں ۔ یہ لوگ غیر زبانوں کی فرھنگوں سے
تلاش کر کر کے بڑے بڑے ثقیل اور نامانوس الفاظ

لاتے ہیں اور چٹانوں کی طرح اپنی تحریروں میں لڑھکا دیتے ہیں اور پھر ان تحریروں کو انشاپردازی اور ادب کے بہترین نمونوں اور شاہکاروں کے طور پر پیش کرتے ہیں ۔ ان کے نزدیک دوسروں کے آسان ، ہلکے پھلکے اور بول چال کے لفظ گنوار اور غیرفصیح ہوتے ہیں اور مصنفین کی کم علمی اور بدذوقی پر دلالت کرتے ہیں ۔ غرض ان کا رویہ احساس کمتری کا غماز ہے — پھر — کچھ لوگ عربی الفاظ کی طرف اس لئے زیادہ مائل ہوتے ہیں کہ عربی ہماری مذہبی زبان ہے اور قرآن اس میں نازل ہوا ہے ۔ بعض فارسی سے بھی کچھ ایسی ہی شدید وابستگی محسوس کرتے ہیں کہ یہ مسلمانوں کی تہذیبی زبان ہے اور پھر کچھ ایسے بھی ہیں جو انگریزی زبان سے مرعوب ہیں کہ یہ ان کے نزدیک بین الاقوامی زبان ہے چنانچہ اس جماعت والے بھی کسی نہ کسی غیر زبان کے شیدائی نظر آتے ہیں ۔

بہرحال دخیل الفاظ سے کچھ فائدے بھی ہوتے ہیں ۔ ان کی مدد سے خیالات کا ذرا سا فرق بڑی آسانی سے ظاہر کیا جا سکتا ہے ۔ ان کے استعمال سے

خیالات کے حدود قطعی اور خطوط واضح ہو جاتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ لکھنے والا ایک ہی لفظ کو بار بار دھرانے سے بچ جاتا ہے اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دخیل الفاظ سے زبان کے سرمائے میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس زبان میں دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ الفاظ پائے جاتے ہیں وہ با ثروت سمجھی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے اُردو زبان اس برصغیر کی تمام زبانوں پر سبقت لے گئی ہے کہ کسی زبان کا اثاثہ اس کے ذخیرہ الفاظ کے سامنے نہیں ٹھیرتا بلکہ ہم اس کے سرمائے کو نہایت فخر کے ساتھ دنیا کی کسی بھی زبان کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔

ان تمام فائدوں کے ہوتے ہوئے جن کا ذکر اوپر کیا گیا دخیل الفاظ کے استعمال میں کچھ نقصانات بھی مضمر ہیں بلکہ غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ نقصانات کی تعداد اور اہمیت فوائد سے زیادہ ہے۔ کسی زبان میں الفاظ کی تعداد زیادہ ہو جانے سے بولنے والوں کے حافظے پر غیر معمولی بار پڑ جاتا ہے چنانچہ ہم لوگوں کو اردو الفاظ کے علاوہ ان الفاظ کو بھی یاد کرنا پڑتا ہے جو سنسکرت فارسی عربی اور انگریزی سے مستعار لئے جا چکے ہیں اور جب تک مستعار لینے کا یہ سلسلہ

جاری رہیگا ہمارے حافظے پر بوجھ بھی برابر بڑھتا رہیگا ۔ یہ صورت حال حد درجہ مصنوعی اور محنت طلب ہے ۔ یہ درست نہیں کیونکہ الفاظ مستعار لینے کا یہ سلسلہ قدرتی ہے ، بناوٹی

دخیل الفاظ کے باعث زبان میں بہت سے مقامات پر الجھنیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جن میں اردو زبان کے لب و لہجہ کے باعث ابہام آجاتا ہے مثلاً سحر اور صہر ۔ ثواب اور صواب بہر (واسطے) اور بحر (سمندر وزن فخر) وغیرہ ۔ بعض ایسے ہیں جو ہماری زبان کے لب و لہجہ سے میل ہی نہیں کھاتے مثلاً شمع طرح ، صبح وغیرہ کہ عربی میں ان کا درمیانی حرف ساکن اور آخری متحرک ہوتا ہے اور اردو کا لہجہ اس کو قبول نہیں کرتا ۔ بعض دخیل الفاظ ایسے ہیں جن کی مکتوبی اور ملفوظی صورت مختلف زبانوں میں ایک ہی ہے لیکن معنی جدا جدا ہیں مثلاً کسر (اردو کمی ۔ عربی ٹکڑا) ۔ سل (اردو پتھر کا ٹکڑا ۔ عربی دق کی بیماری) ۔ کوٹ (اردو قلعہ ۔ انگریزی ایک لباس) بر (اردو بھڑ بمعنی زنبور ۔ فارسی اوپر ۔ عربی خشکی) ۔ چال (اردو رفتار فارسی گڑھا) ۔ بال (اردو رواں ۔ فارسی پر ۔ انگریزی گیند) وغیرہ ۔

تیسرا نقصان یہ ہے کہ دخیل الفاظ کیلئے زبان میں ایک ترجیحی رجحان پیدا ہو جاتا ہے اور لوگ ان کے حق میں اپنی زبان کے الفاظ سے دست کش ہو جاتے ھیں یوں متروکات کی تعداد روز بروز بڑھتی اور زبان کی پونجی گھٹتی چلی جاتی ہے مثلاً جب اردو والے نکاس کی جگہ سرچشمہ یا منبع ، ٹھیٹھ کی جگہ خالص سامنے کی جگہ روبرو یا مقابل ، آنگن کی جگہ صحن ۔ اوجھل کی جگہ پوشیدہ ، پکڑ کی جگہ گرفت، لگاتار کی جگہ متواتر یا علی التواتر یا علی الاتصال لکھتے پڑھتے رھیں گے تو ایک دن ایسا آ جائے گا کہ اردو کے الفاظ حافظے اور علم سے بھی محو ہو جائیں گے ۔ آج بھی اردو میں جتنے دخیل الفاظ استعمال ہو رہے ھیں ان میں سے کچھ ایسے اصل ھیں جن کے ٹھیٹھ مترادفات کی اب شناخت بھی مشکل ہو گئی ہے مثلاً فطرت یا قدرت یا نیچر تہذیب یا کلچر ۔ حرف ۔ تلفظ ۔ کاغذ ۔ دوات ۔ روشنائی دروازہ یا دوار ۔ الماری ۔ برج یا گمبند وغیرہ

دخیل الفاظ زبان کی بالیدگی میں بھی حارج ہوتے ھیں ۔ جب وقت کی تبدیلی کے ساتھ کوئی نیا خیال یا نئی چیز کسی زبان کے بولنے والوں کے سامنے آتی ہے تو

یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جاہل اور بے پڑھے انسان بھی اس کے لئے لفظ سازی کے انہیں اصولوں پر جو اس زبان میں پیشتر سے موجود ہوتے ہیں اپنے ہی کسی مروجہ لفظ سے ایک نیا لفظ گھڑ لیتے ہیں لیکن جب غیر زبان کے بنے بنائے لفظ سے ضرورت رفع کر لی جاتی ہے تو اہل زبان کو اپنی زبان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی نوبت ہی نہیں آتی - لہذا اردو زبان میں دوسری زبانوں سے جتنے زیادہ الفاظ داخل ہوتے رہیں گے اس کی ترقی کے امکانات اتنے ہی کم ہوتے چلے جائیں گے کیونکہ زبان اپنی ہی داخلی قوت سے فروغ پاتی اور آگے بڑھتی ہے -

اس میں شک نہیں کہ اردو زبان میں بعض دخیل الفاظ کا استعمال ہمارے لئے ضروری ہے مثلاً مسلمانوں کی مذہبی اصطلاحات اور ان کی معاشرت کے لوازمات (کھانوں اور کپڑوں وغیرہ) کے ایرانی و عربی نام جو ہماری یومیہ زندگی کا جزو ہیں یہ چیزیں مسلمانوں سے مخصوص ہیں اور ان کے ساتھ ہی ہندوستان میں داخل ہوئی ہیں - ایجادات کے نام جو مغرب سے اپنے موسومات کے ساتھ ہمارے ملک میں آئے ہیں اور سائنسی اصطلاحات

جو دنیا میں عام ہو چکی ہیں ۔ لیکن سنسکرت الفاظ
کو استعمال کرنا اردو زبان میں بناوٹی پن کو فروغ
دینا ہے کیونکہ ان کے مکتوبی اور ملفوظی روپوں میں
زمین آسمان کا فرق ہے ۔ چونکہ ایک خاص سطح تک
سائنسی معلومات بھی دنیا کی روزانہ زندگی میں داخل
ہوچکی ہیں اس لئے اس حد تک ہمیں اپنی ہی زبان سے
سائنسی اصطلاحات وضع کرکے کام چلانا چاہئے کہ وہ
زیادہ عام فہم ہونگی اور ان کے ذریعے روزمرہ کی
سائنس تک ہماری قوم کے ہر فرد کی رسائی بآسانی ہو
سکے گی البتہ اعلی تحقیقات کی سطح پر جب تک
ہمارے یہاں سائنسی اصطلاحات مکمل طور پر نہ بن
جائیں انہیں انگریزی اصطلاحات کو استعمال کر سکتے
ہیں جو بیشتر یونانی و لاطینی زبانوں کی تحریروں سے
اخذ کی گئی ہیں اور جن کے صحیح ملفوظی روپ ہمیں
قدیم و جدید فارسی سے ایک نہ ایک دن ضرور دستیاب
ہو جائیں گے کیونکہ یہ سب زبانیں باہم رشتہ دار ہیں
اس وقت ہم پاکستانیوں کے سامنے ایک اور بھی تجویز
موجود ہے ۔

جب یہ مسلم ہے کہ دخیل الفاظ ہر زبان کا ایک

ناگزیر جزو ہوتے ہیں اور ہمیں بھی اردو زبان کیلئے ان کی ضرورت و اہمیت سے انکار ممکن نہیں تو بہتر یہ ہے کہ ہم بدیسی الفاظ کی جگہ پاکستان کی ہی علاقائی زبانوں کے لغات سے کام لیں کہ ان کا حق بدیسی الفاظ پر مرجح ہے اور اس لئے مرجح ہے کہ اردو اور علاقائی زبانوں میں مشترکہ دراوڑی خاندان کے باعث بنیادی اور مزاجی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جبکہ فارسی آریائی ، عربی سامی اور انگریزی اینگلو سیکسن خانوادے سے تعلق رکھتی ہے اور لسانی خاندانوں کا بنیادی فرق اہل علم سے پوشیدہ نہیں ۔ مراد اس سے یہ ہے کہ اردو اور سندھی یا اردو اورپنجابی میں اتنا فرق نہیں ہے جتنا اردو اور فارسی یا اردو اور انگریزی میں پایا جاتا ہے اوراس فرق کا دخیل الفاظ کی موزونیت یا ناموزونیت میں بڑا ہاتھ ہوتا ہے ۔

الغرض دوسری زبانوں سے بے تامل الفاظ پر الفاظ لیتے چلے جانا نہ صرف غیر ضروری بلکہ اردو کے لئے الٹا نقصان دہ ہے اس لئے ہمیں سب سے پہلے یہ چاہیئے کہ اپنی زبان کے بنیادی ذخیرے اور اس کی صلاحیتوں کا بھرپور جائزہ لے کر اس کی توانائی پر اپنا اعتماد بحال

کریں اور اردو کی کم مائگی کا مفروضہ قائم کرنے والوں کے پروپگنڈے میں نہ آئیں - دخیل الفاظ کی تعداد کو ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھنے دیں - موجودہ دخیل الفاظ کے استعمال میں احتیاط اور اعتدال سے کام لیں اور آیندہ جب کسی لفظ کی ضرورت پڑے تو بدیسی زبانوں کی جگہ اپنی ہی علاقائی زبانوں سے امداد طلب ہوں کہ اس سے اردو کے سمجھنے والوں کا دائرہ وسیع ہوگا اور تمام اہل وطن اس کے واسطے سے اتحاد و یگانگت کی ایک ہی لڑی میں منسلک ہو جائیں گے - //

وہ حد کیسے اور کہاں قائم کریں گے؟ اور یہ فرض کون انجام دے گا؟
اگر ایسا کیا گیا تو یہ بالکل ایک مصنوعی عمل ہوگا؟

رفیع

٢٦/٥/٧٣

اردو میں سائینسی تدریس
کے امکانات

ممتاز حسین
صدر شعبہ اردو
زرعی یونیورسٹی لائلپور

حقیقت تو یہ ہے کہ اردو میں سائنسی تدریس کے امکانات اس قدر روشن ہیں کہ اس پر کسی مقالہ کی ضرورت نہیں - یہ احساس کمتری آخر کیوں ہے کہ ہماری زبان علمی طور پر اس قدر پس ماندہ ہے کہ اس کے ذریعہ سائنس یا ادب کی تدریس ممکن نہیں - زبانیں کم مایہ نہیں ہوتیں بلکہ ان زبانوں کے بولنے اور لکھنے والے علمی اور ذہنی طور پر کم مایہ ہوتے ہیں - جب انہیں علوم و فنون میں پوری دسترس حاصل ہو جاتی ہے تو ان کے اظہار خیال میں خود بخود وسعتیں پیدا ہو جاتی ہیں -

اردو مغربی پاکستان کے ہر گوشے میں سمجھی جاتی ہے - پاکستان بھر میں کوئی اور زبان ایسی نہیں جو ہماری قومی زبان بننے کی اردو سے زیادہ صلاحیت رکھتی ہو - ادبی اور سائنسی مضامین کی تعلیم کا ذریعہ بننے کی بھی اس میں پوری صلاحیت ہے - مدرسین اس میں آسانی سے اپنا مطلب واضح کر سکتے ہیں اور درس پانے والے اس زبان کے مقابلہ میں بھلا کس زبان کو بہتر سمجھ سکتے ہیں - مجھے بحیثیت مشیر ترقیات پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصوں میں کاشتکاروں

مزدوروں اور تاجروں کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ میں نے ہر جگہ اردو میں تقاریر کیں اور سامعین نے مجھے پوری طرح سمجھا۔ مغربی پاکستان میں تو یہی ایک زبان ہے جو سارے علاقوں میں کم و بیش بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

اہل علم اصحاب کا فرض ہے کہ اسے ہر طرح مکمل کریں کیونکہ زبان جب تک قومی زندگی کے تمام تقاضوں اور مطالبوں کو پورا نہ کرے قومی زبان کے منصب اعلی کی حق‌دار نہیں بن سکتی۔ ہمیں اردو کو عہد حاضر کی سائنسی ترقی کا ساتھ دینے اور جدید علوم و فنون کے صحیح اظہار کا ذریعہ بنانے کے لئے تیار کرنا ہے۔

قومی نقطۂ نگاہ سے کسی ملک میں تعلیم کے فروغ سے مراد باشندگان ملک کو علوم وفنون سے واقف کرنا اور انہیں ان کے عملی فیوض و برکات سے استفادہ کے قابل بنانا ہے۔ اگر تمام علمی اور سائنسی معلومات ہمارے قومی کتب خانوں اور چند علماء اور ماہرین کے دماغوں میں محفوظ رہیں تو ہمارے ملک کے لئے بیکار ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ علمی ، ادبی ، صنعتی اور زرعی معلومات ہمارے شہریوں ، دیہاتیوں ، کاریگروں اور کاشتکاروں تک اس شکل میں پہنچ سکیں کہ وہ ان پر عمل پیرا ہو کر ملکی معیشت اور اقتصادی حیثیت کو بہتر بنانیکے قابل ہو جائیں ۔ اس توسیعی کام کیلئے بھی ہمارے پاس آسان ترین ذریعہ اردو زبان ہی ہے ۔ سائنسی تدریس کی راہ میں سب سے بڑی مشکل اردو میں تعلیم دینے کے قابل اساتذہ کی کمی اور سائنس کی درسی کتابوں کمیابی ہے ۔

سائنس کے موجودہ اساتذہ نے ابتدائی تعلیم انگریزی میں حاصل کی اور فارغ التحصیل ہونے کے بعد انگریزی زبان میں ہی پڑھانے کی مشق کی ۔ انگریزوں نے اپنی انتظامیہ اور تاجرانہ مصلحتوں کے پیش نظر نصاب تعلیم کو اس طرح ترتیب دیا کہ سائنسی مضامین میں اعلی تعلیم حاصل کرنیوالے طلباء کو اسکول کی نویں جماعت سے ہی اردو عربی فارسی وغیرہ زبانوں سے محروم کر دیا اسلئے ان میں اردو زبان میں سائنسی تدریس تو کیا خیالات کے اظہار کی صلاحیت بھی پیدا نہ ہو سکی ۔

تقسیم سے قبل برصغیر ہند و پاکستان میں بھی

یہ احساس موجود تھا کہ حکمران قوم نے یہ مخصوص
نصاب تعلیم انگریزی زبان میں بالقصد اختیار کیا ہے ۔
اس سے نجات حاصل کرنیکی کہیں کہیں کوششیں
بھی ہوتی رہیں ۔ پاکستان بننے کے بعد یہ احساس
شدید تر ہو گیا اور ارباب فکر و نظر نے جہاں نصاب
میں تبدیلی ضروری سمجھی وہاں ذریعہ تعلیم کو بدلنا
بھی ناگزیر خیال کیا ان کے پیش نظر یہ مقصد تھا کہ
مختلف علوم و فنون کو اپنا کر اہل ملک کے سامنے
پیش کریں تا کہ پاکستانی باشندے ان سے مستفید ہو
سکیں ۔

اردو زبان کئی زبانوں کا مجموعہ ہے اس میں
وسعت اور لچک ہے ۔ ایک جائزہ کے مطابق اس میں
عربی کے ۵۴ فارسی کے ۴۰ سنسکرت کے ۵ انگریزی کے
۵ ترکی کے ۲ اور یونانی کے ۲ فیصد الفاظ موجود ہیں
اس کے علاوہ اور کئی زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہیں
اس میں مزید ملکی اور غیر ملکی الفاظ کو سمیٹ لینے
کی گنجائش ہے ۔ جب سے مغربی پاکستان ایک صوبہ
بنا ہے اور وسیع بنجر علاقے زیر کاشت آئے ہیں بہت
سی علاقائی زبانوں کے الفاظ اردو میں جذب ہو رہے ہیں

مشینی کاشت اور صنعتی فروغ سے بہت سے غیر ملکی الفاظ
ھماری روزمرہ گفتگو میں اس طرح شامل ہوئے ھیں
کہ جزو زبان بن گئے ھیں - ھاری - مقاطعہ - اگیتی -
پچھیتی-فیکٹری - فیملی - مشین - فارم - ٹریکٹر - ریکارڈ
ٹیم - فینسی - فلم - تھرمامیٹر - انجن - ایکسیلیٹر -
سوسائٹی - فیول پمپ - اکونٹنٹ - ایکٹر - بیم - اور
لیور وغیرہ اس کی مثالیں ھیں - اردو ایک علمی زبان ھے
اسمیں الفاظ اصطلاحات اور اسالیب بیان کا وافر ذخیرہ
موجود ھے اور مزید اضافہ کی بہت گنجائش ھے اس لئے
اس میں سائنس کے لئے تدریسی زبان بننے کے امکانات
بہت روشن ھیں -

سائنس کو اردو میں پڑھانے کا تجربہ پہلی بار
۱۸۴۲ میں دھلی کالج میں کیا گیا جو کامیاب ثابت ھوا
چنانچہ وھاں کے انگریز پرنسپل سی ایف اینڈریوز نے
اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں اعتراف کیا
کہ سائنس کی تعلیم میں وہ طلباء زیادہ کامیاب ہوئے جن
کو اردو میں تعلیم دی گئی تھی - منشی ذکاءاللہ صاحب
نے جو اس کالج سے فارغ التحصیل ھوئے تھے ۱۵۰
کتابیں لکھیں ھیں جن میں ۸۷ ریاضی کے موضوع پر

تھیں - دلی کالج اور سائینٹفک سوسائٹی نے سائنسی کتابوں کے ترجمے شروع کئے اور سائنسی مضامین پر کافی کتابیں لکھیں - ایک تحقیق کے مطابق انیسویں صدی کے اواخر تک ۶۱۸ ایسی کتابیں لکھی گئی تھیں -

سنہ ۱۹۲۷ کی ایک سروے رپورٹ کے مطابق اردو میں سائنس - جغرافیہ - حکمت - فلسفہ - ریاضی - فنون لطیفہ اور دیگر مضامین پر ۱۷,۹۹۷ کتابیں اس سال تک لکھی جا چکی تھیں - ان کی تالیف میں انگریزی کتابوں سے کافی امداد لی گئی تھی - اب ۳۷ برس گزرنے کے بعد تو ان کی تعداد یقیناً بہت زیادہ ہو گئی ہو گی -

عثمانیہ یونیورسٹی کو اردو زبان کی علمی اور درسی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے - اس یونیورسٹی نے بنیادی سائنسوں کے علاوہ انجینرنگ اقتصادیات - طب انگریزی - بیطاری - طبقات الارض - ہندسی مناظر - پرورش حیوانات-زراعت اور دیگر مضامین میں قابل قدر تصنیفات کیں اور ان کو تدریس کا ذریعہ بھی بنایا - اس طرح جو سائنسی علوم انگریزی

زبان میں محفوظ تھے انھیں اردو میں منتقل کر کے اس قومی زبان کو شعر و شاعری اور فسانہ نویسی کی گلکاریوں سے نکال کر ٹھوس علمی بنیادوں پر کھڑا کر دیا ۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں زیادہ تر تراجم پر زور دیا گیا تھا لیکن تجربہ سے ثابت ہوا کہ تراجم سے تالیفات بہتر ھیں ۔ ترجمہ شدہ کتاب میں ایک ھی مصنف کی معلومات منتقل ھوتی ھیں لیکن تالیف اس مضمون کی ان تمام کتابوں کا نچوڑ ھوتی ھے جن کا مصنف نے اس کتاب کی تیاری میں مطالعہ کیا ھو ۔ اس کے علاوہ اس کی شخصیت اور ذاتی تجربات کی جلوہ گری بھی ھوتی ھے ۔ ترجمہ کا طریقہ دیر طلب اور خرچ طلب بھی ھے تقسیم ملک سے پہلے کا کام اس لئے قابل ستائش ھے کہ وہ ناسازگار حالات اور سرکاری مخالفت کے باوجود کیا گیا ۔ آزادی کے بعد سے مختلف ادارے اس قومی خدمت میں مشغول ھیں ان میں کراچی یونیورسٹی مغربی پاکستان بورڈ ۔ انجمن ترقی اردو کراچی ۔ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۔ مغربی پاکستان زرعی یونیورسٹی لائل پور ۔ اردو اکادمی بہاولپور اور مغربی

پاکستان مرکزی اردو بورڈ لاھور قابل ذکر ھیں ۔ ان اداروں میں اردو اصطلاح سازی اور سائنسی کتابوں کے تراجم اور تالیف و تصنیف کا کام ھو رھا ھے ۔ ھماری گورنمنٹ کی اصابت رائے کی بدولت یہ فیصلہ ھو چکا ھے کہ قومی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے چنانچہ انٹر یونیورسٹی بورڈ نے با اتفاق رائے یہ فیصلہ کر لیا ھے کہ سنہ ۱۹۶۹ تک اردو ذریعہ تعلیم بنا دی جائے ۔ اس ضمن میں حکومت نے یہ احکام صادر کئے ھیں کہ سنہ ۱۹۶۷ تک سرکاری دفاتر میں تمام خط و کتابت اردو میں ھونی چاھیئے ۔ یونیورسٹی کو نصابی کتابیں تیار کرنے اور اساتذہ کو اردو میں درس دینے کی مہارت حاصل کرنے کے لئے سنہ ۱۹۶۹ تک کی مہلت دے دی گئی ھے ۔

سائنس کے اساتذہ اردو زبان میں تدریس کی صلاحیت پیدا کرنے میں مشغول ھیں اور متذکرہ بالا ادارے ان کی سہولت کے لئے سائنس کے فرھنگ جدید اور کتابیں اردو میں شائع کر رھے ھیں ۔ سائنس دانوں میں اھل قلم حضرات اور محققین یونیورسٹی کے مقرر کردہ نصاب کے مطابق کتابیں لکھنے میں مشغول ھیں ۔

پنجاب یونیورسٹی نے بی - اے - اور بی - ایس سی کے امتحانات تک انگریزی کے سوا سب مضامین کے سوالات اردو میں دینے کی اجازت دے دی ھے - اردو اکیڈمی مغربی پاکستان نے ان طلباء کی سہولت کے لئے اردو کالج اور مرکزی امدادی ادارے بنادئے ھیں جو انہیں امتحانوں کی تیاری کے لئے مواد بہم پہنچاتے ھیں- مغربی پاکستان کا مرکزی بورڈ مترجمین اور مصنفین کی حوصلہ افزائی کے لئے گراں قدر معاوضہ دے رھا ھے - اچھی کتابوں کی مانگ بڑھ رھی ھے اور غیر معیاری کتابوں کو تعلیمی ادارے ترک کر رھے ھیں - کراچی یونیورسٹی نے اردو کو مکمل طور سے ذریعہ تعلیم کر دیا ھے اساتذہ اپنے روزانہ درس اردو میں لکھ کر دیتے ھیں اور یہ درس کتابچوں کی شکل میں طلباء میں تقسیم کر دیئے جاتے ھیں - اس طرح دوسری یونیورسٹیاں اس سلسے میں قابل قدر کام کر رھی ھیں - مغربی پاکستان کی زرعی یونیورسٹی نے کراچی یونیورسٹی کے طریقہ تالیف کو اختیار کیا ھے اور اب تک ابتدائی تعلیم کے لئے زراعت - نباتات - باغبانی حشریات - پرورش حیوانات کے مضامین پر چھ نصابی

کتابیں تیار کی ھیں ان کے علاوہ چھ اور کتابیں سبزیات زراعت - تنظیم نوجوانان - امداد باھمی - میکانکی آلات زراعت اور جنگلات پر زیر تالیف ھیں - اس کے علاوہ زرعی یونیورسٹی نے بی ایس سی کے معیار کی کتابوں کی تیاری کے لئے مستند انگریزی کتابوں کے ترجمے اور دیگر نصابی کتابوں کی تصنیف کا کام شروع کرنیکا پروگرام بھی بنایا ھے - اس کام کے لئے ھر شعبہ میں سے ایک ایک ماھر مامور کیا گیا ھے جو اپنے دوسرے رفقائے کار کی معاونت سے اس کام کو سر انجام دیگا -

زرعی یونیورسٹی کا اردو ادارہ تصنیف و تالیف کے کام میں ان مصنفین کی ھر طرح مدد کرے گا - اس طرح اساتذہ بتدریج اردو زبان میں سائنسی مضامین کی تشریح کرنے میں مہارت حاصل کر لینگے - مغربی پاکستان کے مختلف ادارے جن میں کراچی یونیورسٹی پیش پیش ھے مختلف ادبی اور سائنسی فرھنگ تیار کر رھے ھیں - زرعی یونیورسٹی کے شعبہ تالیف و تصنیف نے زراعت اور متعلقہ سائنسوں کی اصطلاحات کے فرھنگ تیار کرنے شروع کردئے ھیں اور اب تک زراعت -

معاشیات - حشریات- نباتیات - کیمیا - طبعیات- حیاتیات تناسلیات - بیطاری - انجنیرنگ - مائیات - موسمیات - دیہی عمرانیات - ارضیات - پرورش حیوانات اور تعمیرات کی تقریباً ۴۰۰۰۰ اصطلاحات جمع کر لی ھیں جن میں سے تقریباً ۲۰۰۰۰ اصطلاحات کا ترجمہ انگریزی کے حرف " آئی "، تک کیا جا چکا ھے - اس ترجمہ پر مغربی پاکستان اردو اکیڈمی اور یونیورسٹی کے ماہرین نظر ثانی کرتے ھیں جسے تصدیق کے بعد لغت کی شکل میں شائع کیا جائے گا - اصطلاحات کا ترجمہ کرتے وقت اس بات کا بطور خاص خیال رکھا جاتا ھے کہ اردو مترادف الفاظ دینے کے ساتھ ساتھ طلباء کے فائدہ کیلئے اصطلاحات کی تشریح بھی کر دی جائے - پرانے ترجموں اور دوسرے اداروں کی مطبوعات سے حاصل کردہ اصطلاحات میں زرعی فن کے نقطہ نگاہ سے حسب ضرورت اضافہ اور تبدیلیاں کی جاتی ھیں -

نصابی کتابوں کے ترجمے اور تصنیف اور فرهنگوں کی ترتیب میں کراچی یونیورسٹی کے دستور کی پیروی کی جارهی ھے - نصابی ترجموں اور تصانیف میں بین الاقوامی سائنسی اصطلاحات مثلاً کیمیائی عناصر کی علامتوں -

کیمیائی عناصر اور مرکبات کے ناموں۔ مشہور ادویہ اور ان کے ناموں علم حیاتیات کے لاطینی ناموں۔ علم ریاضی کی علامتوں وغیرہ کو اسی طرح رکھا جاتا ھے نیز بیماریوں - بدیشی درختوں - جھاڑیوں اور گھاس کے ناموں کو اپنی اصلی شکل میں رکھا جاتا ھے - کیمیائی عناصر اور مرکبات مثلاً لوھا - نیلاتھوتھا - گندھک وغیرہ جن کےاردو نام‌رائج ھیں‌اردو زبان‌میں لکھے جاتے ھیں - دیگر مرکبات اور ادویہ وغیرہ کے انگریزی نام مثلاً نسولین - پنسلین - ایکٹینیم - ڈوالیہ - پنیزی - للی وغیرہ برقرار رکھے جاتے ھیں لیکن اردو رسم‌الخط میں لکھے جاتے ھیں - جن انگریزی اصطلاحات کے موزوں متبادل بن چکے ھیں ان کو تصانیف میں اردو ناموں کے ساتھ خطوط وحدانی میں لکھ دیا جاتا ھے تاکہ طلباء اور اساتذہ ان سے پوری طرح مانوس ھو جائیں -

زراعت اور اس سے متعلق علوم کے فرھنگ عام لغات سے امتیازی شکل کے ھوتے ھیں - زراعت نے موجودہ زمانہ میں ایک فن کی حیثیت اختیار کر لی ھے اور اس میں تمام بنیادی سائنسوں کے علاوہ تکنیکی علوم اور ان کی اصطلاحات بھی رواج پاگئی ھیں اس کی‌زبان کا

دامن بتدریج وسیع ہوتا جا رہا ہے - مختلف علوم کے
ماہرین اپنی نئی نئی سائنسی تحقیقات اور تجربوں کے
دوران کئی ایک نئے الفاظ وضع کر لیتے ہیں جو اس
سائنس کی زبان کا جزو بن جاتے ہیں - اسلئے اسکا فرہنگ
عام لغات سے مختلف ہوتا ہے - ایک ہی لفظ اسکی
مختلف شاخوں میں مختلف معانی کا اظہار کرتا ہے مثال
کے طور پر ماہرین حشریات کیڑوں کے حملہ سے مردہ
شگوفوں کیلئے (DEAD HEARTS) کی اصطلاح
استعمال کرتے ہیں جسکا مطلب ایک عام زبان دان
کے خیال سے کچھ اورھی ہے - اسی طرح (CUT) کے
چھوٹے سے لفظ کے معنی قطع - کٹائی - تراش - ضرب
چبھتا طعنہ وغیرہ ہیں - زرعی زبان میں اس لفظ سے مراد
گوشت کا ٹکڑا - گھوڑے کا اپنی ٹانگوں کو رگڑنا -
گلہ یا ریوڑ سے جانور کا علیحدہ کرنا - پودے سے کسی
حصہ کا علیحدہ کرنا - زخم - کٹاؤ - جراحت - اور مالی
حصہ وغیرہ ہیں - ہم عموماً ان علوم کی اصطلاح سازی
پر توجہ دیتے ہیں جن کا تعلق زرعی تعلیم سے ہے - دیگر
اصطلاحات وضع کرتے ہوئے مروجہ مقامی ناموں اور
مطالب کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے مثلاً (BLIGHT)

کے معنی روکھ جون - پت روگ - اور فصلوں کا یرقان ھیں -

حضرات - اردو زبان کے قومی حیثیت پا جانے سے عوام و خواص اسکی طرف متوجہ ھو گئے ھیں - اس کی حدود اور جملہ توانائیوں کا اندازہ کیا جا رھا ھے - اس کے دامن کی وسعت اور معنوی گہرائیوں کے متعلق سوچ بچار ھو رھا ھے اسکی علمی اور عملی استطاعت پر غور کیا جا رھا ھے اور اس طرح اس قومی زبان کو فی الحقیقت قومی بنانے کی کوشش کی جا رھی ھے - اخبارات - رسائل صوبائی اور قومی اسمبلیوں - ملکی ریڈیو کی نشریات - قومی رھنماؤں کی تقاریر اور بڑے بڑے تعلیمی اداروں کے انداز فکر و عمل سب پر اردو کا سحر آفریں اثر نمایاں ھے - گھروں میں پنجابی اور دیگر علاقائی زبانیں بولنے والے والدین بھی اپنے نونہالوں سے اس زبان میں گفتگو کرتے ھیں - یہ سب علامتیں ھمیں اس زبان کے شاندار مستقبل کی گواھی دیتی ھیں -

سائنسی تدریس کے لئے اس زبان کو روز بروز زیادہ سے زیادہ موزوں بنایا جا رھا ھے یہی وجہ ھے کہ ھمارے ماھرین تعلیم اردو زبان کی تدریسی وسعتوں سے

مطمئن نظر آتے ہیں۔

بہر حال اردو میں سائنسی تدریس کے امکانات درخشان ہیں۔ اللہ تعالی ہمیں جرأت مندانہ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

(آمین ثم آمین)

غیر ممالک میں احمدی اردو کی ترویج و اشاعت میں کیا حصہ لے رہے ہیں

نسیم سیفی

۱۹۵۰ء میں میں نائیجیریا مغربی افریقہ سے پاکستان واپس آرہا تھا۔ راستے میں عدن میں مجھے چند روز قیام کرنے کا موقع ملا ۔ وہاں میرے میزبان ڈاکٹر بشیری صاحب مرحوم تھے جو احمدیہ جماعت کے ایک نہایت مخلص اور سرگرم کارکن تھے ۔ سیاسی حلقوں میں بھی انکی اچھی خاصی رسائی تھی ۔ جس روز میں عدن پہنچا ہوں اس سے اگلے ہی دن وہ مجھے ایک دوست شیخ محمد عبداللہ صاحب سے جو ان دنوں وہاں کی حکومت کے ایک نہایت معزز عہدیدار تھے ملانے کے لئے لے گئے ۔ شیخ صاحب سے ابھی گفتگو بھی شروع نہ ہوئی تھی کہ ڈاکٹر بشیری صاحب کہنے لگے سیفی صاحب ہماری جماعت کے مبلغ ہیں اور شاعر بھی ۔ اور پھر میری طرف مخاطب ہو کر فرمانے لگے سیفی صاحب شیخ صاحب کو کوئی نظم سنائیں ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں یہ بات سن کر ھکا بکا رہ گیا ۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ میں شعر کہتا ہوں لیکن نہ صرف یہ کہ میں مشاعروں کا شاعر نہیں بلکہ اگر صرف یارو احباب ہی کی مجلس ہو تو پھر بھی مجھے شعر سنانے میں ھچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے ۔ مجھے ھمیشہ اپنے متعلق

اس بات کا احساس رھتا ھے کہ میں ایک غیر شاعر شاعر ھوں لیکن یہاں ایک طرف تو ڈاکٹر بشیری صاحب جو میرے میزبان تھے اور نہایت ھی مہربان میزبان اور دوسری طرف شیخ محمد عبداللہ صاحب جنکے بشیری صاحب سے بہت ھی اچھے تعلقات تھے ۔ میں نے انتہائی استعجاب اور حیرت کے باوجود اپنے ھینڈ بیگ میں سے ایک نوٹ بک نکالی اور چند اشعار انکی خدمت میں پیش کر دیئے ۔

یہ واقعہ بذات خود کسی اھمیت کا حامل نہیں لیکن میرے مقالہ کا عنوان ھے بیرونی ممالک میں احمدیہ جماعت اردو کی کیا خدمات سرانجام دے رھی ھے اور یہ واقعہ میرے موضوع سخن کو تصویری رنگ میں پیش کرنے کی بہترین مثال کہا جا سکتا ھے ۔

ھمارے پاکستانی احمدی دوست جہاں بھی ھیں اردو کے ساتھ نہ صرف رابطہ قائم رکھتے ھیں بلکہ اسے فروغ دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے ۔ جس واقعہ کا میں نے ابھی ذکر کیا ھے اس سے مکرم ڈاکٹر بشیری صاحب کے اردو کے ساتھ لگاؤ کا پتہ چلتا ھے ۔ لیکن دو چار روز ھی کے بعد وہ اس سے بھی ایک قدم

آگے نکل گئے - اور عدن میں باقاعدہ ایک مشاعرہ کروا دیا گیا -

بشیری صاحب اس مشاعرہ کی روح رواں تھے خود بھی شعر کہتے تھے اور بہت اچھا شعر کہنے والے تھے اس کے بعد گاھے گاھے ایسے مشاعرے ھوتے رھے اور اب تو عدن میں باقاعدہ مشاعرے ھوتے ھیں - میں اس سال نائیجیریا سے دوبارہ واپس آتے ھوئے عدن ٹھہرا تو مجھے پتہ چلا کہ اب مشاعرے نہائت باقاعدگی کے ساتھ ھوتے ھیں اور ھماری جماعت کے دوست ان میں کافی دلچسپی لیتے ھیں -

عدن میں تو مشاعرے غالباً اس لئے بھی باقاعدگی کے ساتھ ھوتے ھیں کہ عدن پاکستان سے بہت ھی قریب ھے - لیکن لندن میں بھی باقاعدہ مشاعرے ھوتے ھیں اور وھاں بھی ھماری جماعت کے دوستوں نے میری ان مشاعروں کی طرف رھنمائی کی - جبکہ ھمارے مبلغین ھی مجھے ان مشاعروں میں لے جاتے رھے - اور میں نے دیکھا کہ وھاں بھی ھمارے مبلغین ان مشاعروں کے انعقاد میں نہائت دلچسپی سے حصہ لیتے ھیں -

اگرچہ ان مشاعروں کا معیار تو بہت زیادہ بلند نہیں لیکن پاکستان سے ہزاروں میل دور اردو زبان میں دلچسپی قائم رکھنے کا ایک ذریعہ تو ہیں - میں نے ایسے ہی ایک مشاعرہ پر ایک نظم پڑھی تو اس کے اگلے روز مجلس مشاعرہ کے سیکرٹری صاحب نے مجھے ٹیلیفون پر پوچھا کہ اس نظم کا مطلب کیا تھا - کہنے لگے کہ میں روداد لکھ رہا ہوں اور مجھے اس نظم کے متعلق کچھ ذرا تفصیل سے لکھنا ہے - در اصل اس نظم میں جس خیال کو پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ایک سپاہی جنگ پر جاتے وقت گھر سے نکلتے ہی اپنی رفیقۂ حیات کے متعلق سوچنے لگتا ہے اور اسکی خیالی تصویر اس کے ذہن میں رقص کرنے لگتی ہے - اس طرح لندن ہی میں یوم اقبال پر پاکستان ہائی کمیشن نے ایک مشاعرہ منعقد کیا - میں تو لندن میں اپنے مشن کا مہمان ہی تھا کیونکہ میری منزل نائیجیریا تھی اور لندن میں عارضی قیام تھا - وہاں بھی مجھے ہمارے مشن کے مبلغ ہی اپنے ساتھ لے کر گئے - اور اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مشاعروں میں شرکت کرنا یقیناً ایک رنگ میں اردو زبان کی خدمت کرنا ہے -

اس موقعه پر میں نے علامه اقبال مرحوم پر ایک نظم کہہ لی تھی جو وھاں پیش کی گئی -

حقیقت یه ھے که آج سے بیس سال قبل جب میں نائیجیریا میں تبلیغ اسلام کے لئے جانے کی تیاری کر رھا تھا تو میرے بعض کرم فرماؤں کا خیال تھا که مجھے وھاں بھیجنے کا کیا مطلب ھے- ایسے ھی کرم فرماؤں میں سے ایک سردار دیوان سنگھ صاحب مفتون تھے - انھوں نے اپنی کتاب ''ناقابل فراموش'' میں میرے متعلق مندرجه ذیل الفاظ تحریر کئے ھیں جو میں سمجھتا ھوں که موضوع کے لحاظ سے آپ حضرات کی دلچسپی کا باعث ھونگے -

''تبادلهٔ آبادی سے پہلے ایک احمدی نوجوان گورنمنٹ آف انڈیا کے دفتر میں سرکاری ملازم تھے - جن کا نام نسیم سیفی تھا - یه وھاں اڑھائی تین سو روپیه ماھوار تنخواه پاتے تھے اور ھفته میں ایک دو بار دفتر ریاست میں ضرور تشریف لاتے کیونکه ان کی نظمیں ریاست میں شائع ھوتیں یه بہت اچھی نظمیں کہتے تھے اور میرا یقین تھا که انکا مستقبل بطور ایک شاعر کے بہت ھی شاندار ھے چند ماه یه دفتر ریاست میں آتے رھے تو

اس کے بعد آپنے ایک روز فرمایا کہ اب سرکاری ملازمت ترک کرکے افریقہ جا رہے ھیں اور وھاں یہ بطور ایک احمدی مبلغ کے اسلام کی تبلیغ کرینگے میں نے پوچھا کہ وھاں کیا تنخواہ ملیگی تو انہوں نے بتایا کہ ساٹھ روپیہ ماھوار - ان کے اس جواب کو سن کر میں نے ان سے کہا کہ تم بہت ھی بےوقوف ھو جو اڑھائی تین سو روپیہ ماھوار کی مستقل سرکاری ملازمت چھوڑ کر ساٹھ روپیہ ماھوار کی غیر سرکاری ملازمت اختیار کر رہے ھو مجھے اب تک یاد ھے میرا جواب سنکر یہ مسکرا دیئے اور غالباً اسی ھفتہ یہ ملازمت چھوڑ کر افریقہ چلے گئے - ان مسٹر نسیم سیفی سے اس کے بعد کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ھوا اورپندرہ سولہ برس تو ان کا کوئی خط بھی نہیں ملا اور مجھے یہ علم بھی نہیں کہ یہ آجکل کہاں ھیں مگر یہ واقع ھے کہ جب بھی کوئی احمدی مجھ سے ملتا ھے تو میں اس سے انکی خیریت کے متعلق دریافت کرلیتا ھوں اور میرے دل میں اس شخص کے لئے نہ صرف انتہائی عزت و احترم بلکہ کچھ محبت کے جذبات بھی موجود ھیں اور میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کی قربانی کی سپرٹ افریقہ میں کتنے

لوگوں کو احمدیوں کے حلقہ میں لانے کا باعث ہوتی ہوگی ،، ۔

بہر حال یہ محض اللہ تعالی کا فضل ہے کہ مجھے ایک لمبے عرصہ تک تبلیغ اسلام کا موقعہ ملا ہے اور اس کے ساتھ ہی پاکستان اور اردو کی بھی کسی نہ کسی رنگ میں خدمت کا موقع ملتا رہا ہے ۔ پاکستان کی آزادی کے معاً بعد نائیجیریا میں ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ وہاں کی ایک سیاسی پارٹی نے پاکستان کے لفظ کو برے معنوں میں استعمال کرنا شروع کر دیا بلکہ ایک انٹی پاکستان موومنٹ نے بھی وہاں جنم لے لیا ۔ ان حالات میں مجھے سالہا سال تک پاکستان کے نظریہ کو واضح کرنے کے لئے اور لوگوں کے غلط خیالات کو درست کرنے کے لئے اخباروں میں مضامین لکھنے پڑے ۔ ایسوسی ایشن آف ورلڈ افیرز سٹوڈنٹس کے پلیٹ فارم سے میں نے ،، ھندوستان کا ماضی اور حال ،، کے عنوان پر تقریر کی ۔ ریڈیو پر ،، پاکستان میں زندگی ،، کے عنوان پر ایک تقریر نشر کی ۔ اخبارات میں ،، ھندوستان میں دو قوموں کا نظریہ ،، کے عنوان سے خاصے طویل مضمون لکھے اسی طرح ،، مسلمانوں کی خدمات ،، پر بھی

ایک مضمون لکھا ۔ ان کے علاوہ ایک اخبار میں اردو کے متعلق بعض غلط باتیں شائع ہو گئیں تھیں انکی درستی اخبار ھی کے ذریعہ کروائی ۔ یہ تمام مضامین ایسے ھیں جن میں اردو کا زیر بحث آنا لازمی تھا ۔ چنانچہ اس طرح لوگوں کو اردو سے روشناس کروایا ۔

پاکستان کے متعلق تو میں نے اپنے مضامین ۔ اخباروں کے ایڈیٹوریل اور قارئین کے خطوط پر مشتمل ایک کتاب بھی مرتب کی ھے جس کا نام ھے ۔

"IN DEFENCE OF PAKISTAN"

حضرات جہانتک اردو کی خدمت کا تعلق ھے میں سمجھتا ھوں کہ جن باتوں سے یہ فریضہ سرانجام دیا جا سکتا ھے وہ یہ ھیں

(۱) زبان کو قائم رکھنا ۔ اور بیرونی ممالک میں اسکا مطلب یہ ھو گا کہ زبان کا بولنا ۔ پڑھنا اور لکھنا کسی نہ کسی رنگ میں جاری رکھنا ۔

(۲) زبان کی تعلیم دینا یعنی بیرونی لوگوں کو زبان سے روشناس کرانے کے لئے اردو زبان سکھانا ۔

(۳) اس زبان میں مضامین لکھنا یا شعر کہنا ۔ بیرونی ممالک میں یہ بات نہائت محدود طریق پر ھی

میسر آسکتی ہے لیکن بہرحال جہاں بھی میسر
آسکے وہاں اس سے فائدہ اٹھانا اردو کی خدمت
ہی کے ضمن میں شامل ہوگا۔

(۴) اچھے نثر نگاروں یا شعراء کا لوگوں سے تعارف
کرانا۔

(۵) اردو کی کتابوں کو ترویج دینا۔

(۶) لائبریریاں قائم کرنا۔

(۷) مذاکرات یا مشاعرے منعقد کرنے۔

بے شک ان باتوں کے علاوہ بھی کئی ایک ایسی
باتیں ہیں جو خدمت اردو کے پروگرام میں شامل کی
جا سکتی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو باتیں میں
نے پیش کی ہیں یہ اس سلسلہ کی سب سے اہم کڑیاں
ہیں۔

میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے اس سے بیرونی
ممالک میں اپنی جماعت کے ممبروں مشاعروں میں
دلچسپی کا اظہار رہتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز
نہیں کہ ہماری جماعت کے افراد صرف اور صرف
مشاعروں ہی میں شمولیت کرتے ہیں اور ان کی اردو
کی خدمت کی پونجی صرف یہی ہے۔ ہمارے بڑے مشن

اردو کی کلاسیں جاری کرتے ھیں ۔ چنانچہ میں نے
خود نائیجیریا میں اردو کی کلاس جاری کی اور اگرچہ
یہ کلاس بہت عرصہ تک تو جاری نہ رکھی جا سکی
لیکن میں سمجھتا ھوں کہ اس کا نہایت خوشگوار اثر
پڑا اور کم از کم وہ لوگ جو اس کلاس میں شامل
ھوئے ذھنی طور پر پاکستان کے زیادہ قریب ھو گئے۔
مجھے یہ بھی معلوم ھے کہ غانا میں بھی اکا دکا
لوگوں کو ھمارے مبلغین اردو پڑھاتے ھیں ۔

جہاں تک اردو کے اچھے مصنفین اور شعراء کا
بیرونی ممالک کےلوگوں سے تعارف کا تعلق ھے ۔ ھمارے
بہت سے مشنوں میں CRIES IN THE NIGHT جو اردو
کے جدیدشاعروں کی نظموں کا انگریزی ترجمہ ھےاورصوفی
عبدالقدیر نیاز کی کوششوں کا مرھون منت ھے ھمارے
مبلغین نے اپنے اپنے ملک کے ادیبوں اور شعراء کو
تحفتاً دیا میں نے خود نائیجیریا میں بعض ادیبوں کو
یہ ترجمہ دیا اور اسکا نہائت ھی اچھا اثر ھوا ۔

لیکن اس سے بھی زیادہ جو چیز بیرونی ممالک کے
لوگوں کو اردو کے مصنفین سے روشناس کراتی ھے
اور انکو اردو اور پاکستان کے قریب لاتی ھے وہ ھے

احمدیه لٹریچر - همارے بانیٔ سلسله حضرت احمد علیه السلام کی اکثر تصانیف اردو میں هیں اور بیرون ممالک میں نه صرف هماری جماعت کے افراد بلکه دوسرے ایسے لوگ بھی جو احمدیه جماعت کے متعلق مزید واقفیت حاصل کرنا چاهتے هیں اور اگرچه اردو تو وه لوگ نهیں پڑھ سکتے لیکن جب ان کتابوں یا ان کتابوں کے بعض حصوں کا انگریزی ترجمه پڑھتے هیں تو انهیں اس بات کا بھی احساس هوتا هے که یه اردو زبان کا ترجمه کیا هوا هے - اور حقیقت یه هے که بیرونی ممالک اردو کی سب سے بڑی خدمت تو اردو لٹریچر کو بیرونی ممالک کی زبانوں میں ترجمه کر کے هی کی جا سکتی هے اس سلسله میں هماری جماعت ایک منفرد حیثیت کی مالک هے کیونکه هماری سب سے بڑی خواهش یه رهتی هے که حضرت احمد علیه السلام کی تصانیف کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے - هم سمجھتے هیں که اس زمانے میں حقیقی اسلام کو پیش کرنے کا ایک هی ذریعه هے اور وه هے حضرت احمد علیه السلام کی کتب - اور یه لوگ جو اسلام کی خدمت کے لئے باهر جاتے هیں حضرت اقدس کی کتب کے ترجمے هی لوگوں کے سامنے پیش کرتے

ھیں ۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ھوں کہ یہ ایک
نہایت ھی وسیع میدان ھے اردو کی خدمت کی ھم نے
لوگوں کے دلوں میں ایک لگن لگا دی ھے کہ حضرت
احمد علیہ السلام کی جملہ کتب کے بیرونی ممالک کی
زبانوں میں جلد از جلد ترجمہ ھونا چاھیئے ۔ جس قدر
زیادہ ان کتب کا ترجمہ ھوتا چلا جا رھا ھے اتنا ھی
زیادہ بیرونی ممالک کے لوگ اردو سے روشناس ھوتے
جا رھے ھیں بلکہ ترجمے پڑھکر ان کے دل میں تڑپ
پیدا ھو جاتی ھے کہ وہ اصل کتاب بھی پڑھنے کے قابل
ھو جائیں تو اچھا ھے ۔ چنانچہ میں یہ کہتے ھوئے
ایک گونہ خوشی اور فخر محسوس کرتا ھوں کہ دنیا
میں صرف اور صرف ھمارا ھی ایک مرکز ھے جس نے
دنیا بھر میں اردو کی خدمت کے سامان مہیا کئے
ھیں ۔ اور وہ اس طرح کہ ربوہ میں جامعہ احمدیہ کے
زیر اھتمام اردو کا ایک الگ شعبہ قائم ھے جہاں بیرون
ممالک کے طلباء کو اردو پڑھائی جاتی ھے ۔ اردو کی
اس کلاس میں یورپ کے مختلف ممالک کے لوگ چین
کے لوگ ۔ انڈونیشیا کے لوگ ۔ مشرقی اور جنوبی افریقہ
کے لوگ ، امریکہ کے لوگ غرضیکہ دنیا کے ھر علاقے

کے لوگ اردو کی تعلیم پاتے ھیں یا پا رھے ھیں - یہ بات کہتے ھوئے میں اس لئے بھی خوشی محسوس کرتا ھوں کہ بیرون ممالک کے لوگوں کو اردو کی تعلیم کا کام جامعہ احمدیہ میں میرے والد بزرگوار کے سپرد ھے اور باوجود اس کے کہ وہ ساری عمر سکولوں میں پڑھانے ھی کا کام کرتے رھے ھیں ان کے لئے تعلیم و تعلم کا حاصل زندگی اردو اور اسلام کی یہ خدمت ھے جو وہ اب سرانجام دے رھے ھیں اور جب ان کے طلبا اپنے ممالک میں واپس جا کر اردو میں خط لکھتے ھیں تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رھتی -

اگر آپ مغربی افریقہ میں بیٹھے ھوں اور وھاں کے ایک باشندے سے اردو میں باتیں کر رھے ھوں یعنی وہ بھی اردو ھی میں آپ سے بات کر رھا ھو تو آپکو ایک لازوال خوشی حاصل ھوگی -

مجھے بارھا یہ خوشی حاصل ھوتی ھے - کیونکہ وھاں کے ایک ھونہار طالبعلم یہاں سے اردو پڑھ کر گئے ھیں - اور اب خدا کے فضل سے نہایت شستہ اردو میں گفتگو کرتے ھیں - اور پاکستانی دوستوں کو خط بھی اردو زبان ھی میں لکھتے ھیں -

ہماری جماعت کی یہ خدمت جسکا سرچشمہ تو مرکز میں ہے - لیکن جسکا سہرا بیرونی جماعتوں کے سر بھی ہے - ایک ایسی خدمت ہے - جو ہماری جماعت کو باقی ہر ایسے ادارے سے جو اردو کی خدمت کررہا ہے - ممتاز کر دیتی ہے - اور یہ محض اللہ تعالی کا احسان ہے - کہ ہماری ان حقیر خدمات کو اردو کے بہی خواہ نیک نیتی سے سراہتے بھی ہیں - بیرونی ممالک میں ہماری جماعت کی خدمات کا تو غالباً بہت سے لوگوں کو کوئی علم نہیں - لیکن ہند و پاکستان کے متعلق انجمن ترقی اردو پاکستان کے میگزین قومی زبان کے مدیر مشفق خواجہ صاحب کے یہ الفاظ پڑھ کر مجھے بیحد خوشی ہوئی - آپ نے ہماری جماعت کے ایک ادارے کی طرف سے شائع ہونے والے ایک مجلہ کے متعلق اس مجلہ کے مدیر کو خط لکھا - تو اس میں یہ بھی فرمایا "ایک بات مجھے اور عرض کرنی ہے - بابائے اردو مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ جماعت احمدیہ نے اردو زبان کی جسقدر خدمت کی ہے - وہ کسی دوسری جماعت نے نہیں کی - انکا ارادہ تھا کہ جماعت احمدیہ اور اردو کے عنوان سے ایک مقالہ لکھوایا جائے گا - "

اردو کی خدمت کے سلسلہ میں ایک اور بات جس میں ہماری جماعت دوسرے تمام اداروں سے ممتاز ہے۔ یہ ہے کہ ہم نے دنیا کے سو سوا سو بڑے بڑے شہروں میں اردو کی لائبریریاں قائم کر دی ہیں۔ اور ان لائبریریوں میں سینکڑوں کی تعداد میں اردو کی کتابیں موجود ہیں۔ یہ تمام لائبریریاں ہمارے مشنوں کے ساتھ ملحق ہیں۔ اور ہر وہ شخص جو ان لائبریریوں سے فائدہ اٹھانا چاہے اس کے لئے یہ لائبریریاں ہر وقت کھلی رہتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے۔ کہ ہم ہر وقت اس کوشش میں رہے ہیں۔ کہ لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان لائبریریوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ لیکن جیسا کہ یہ بات ظاہر ہے فی الحال ان لائبریریوں سے صرف مستشرق ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اور انکی تعداد بہت ہی کم ہے۔ لیکن حضرات کیا یہ بات اپنی ذات میں ایک خاص اہمیت کی حامل نہیں کہ اردو زبان کی لائبریریاں دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں قائم کر دی جائیں کسی زبان کی کتابوں کی لائبریری قائم کر دینا غالباً اس زبان کی سب سے بڑی خدمت ہوتی ہے۔ یہ محض اللہ تعالی کا احسان ہے۔ کہ اس نے ہماری جماعت کو

اس بات کی توفیق دی ہے ۔ کہ ہم نے بیرونی ممالک میں اردو کی کتابیں مہیا کی ہیں ۔ اور انکی لائبریریاں قائم کر دی ہیں ۔

میں اپنے ان مشنوں کا ذکر کئے بغیر اس مقالہ کو ختم نہیں کر سکتا جو اپنے اپنے ملکوں میں اردو جاننے والوں کیلئے اردو زبان میں نیوز بلیٹن جاری کرتے ہیں ۔ ایسے مشنوں میں مشرقی افریقہ اور فجی کے جزائر خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

زبان کو زندہ رکھنے اور ترویج دینے کیلئے اخبارات یا بلیٹن کی اشاعت ایک اہم کردار ادا کرتی ہے ۔ اور اللہ تعالی کے فضل سے ہماری جماعت کے بیرونی مشنوں میں بعض کو یہ خدمات بجا لانیکی بھی توفیق مل رہی ہے ۔

الغرض ہماری جماعت نے نہ صرف ہند و پاکستان میں اردو کی خدمت کی ہے ۔ بلکہ بیرونی ممالک میں بھی ہر رنگ میں اردو زبان کو قائم رکھنے اور لوگوں سے روشناس کرانے اور اسکی مزید ترقیات کے دروازے کھولنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ۔ یہ محض اللہ تعالی کا فضل اور احسان ہے ۔ اور ہم اسکا جتنا

بھی شکریہ ادا کریں کم ہے ۔

میں آپ حضرات کا بھی ممنون ہوں ۔ کہ آپ نے میری گذارشات کو نہایت صبر اور خندہ پیشانی سے سنا ہے ۔ جزاکم اللہ